جھوٹ کا
پیغمبر
غلام اکبر

*Say:*

**ALLAH IS ABLE TO SEND PUNISHMENT ON YOU FROM ABOVE YOUR HEAD, FROM BENEATH YOUR FEET, AND CAN CAUSE SPLIT AMONGST YOU TO MAKE YOU TASTE THE TYRANNY OF ONE ANOTHER.**

**SURA: THE CATTLE.**
**THE HOLY QURAN**

"مجھے اپنی اُمّت کے لیے جس شخص سے زیادہ خطرہ لاحق ہے وہ ایک منافق آدمی ہے جس کی زبان بڑی چکنی چپڑی مگر اس کا دل نورِ حکمت سے خالی ہے۔ وہ اپنی فصاحت و بلاغت سے لوگوں میں انقلاب پیدا کرتا ہے اور اپنی جہالت کے باعث ان کی گمراہی کا موجب بنتا ہے۔"

(حدیثِ نبویؐ)

ابوزہرہ محمد پروفیسر قانون الاسلامی
الازہر یونیورسٹی (مذاہب اسلامیہ)

# جھوٹا پیغمبر

مصنف

غلام اکبر



تعبیر پبلیکیشنز

۴۲۔ گارڈی چیمبرس
گارڈی ٹرسٹ بلڈنگ

لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

# "صاحبِ کتاب"

"—— —— —— یہ کوئی تاریخی دستاویز نہیں، میرے جذبات کی کہانی ہے۔ ان جذبات کی کہانی جو میرے ہی نہیں، میرے لاکھوں ہم وطنوں کے جذبات بھی ہیں۔ یہ سب کچھ لکھتے وقت میں محسوس کر رہا ہوں، میں صرف غلام اکبر ہی نہیں، پاکستان بھی ہوں۔ یہ صرف میرے جذبات کی ہی نہیں، پاکستان کی کہانی ہے۔ اُس پاکستان کی کہانی، جسے بھٹو نے کاغذ کا ٹکڑا سمجھ کر پھاڑ ڈالا۔ میرا قلم بھٹو کے بارے میں ہرگز ہرگز غیر جذباتی نہیں ہو سکتا۔ میں اس جھوٹ سے نفرت کیوں نہ کروں، جسے کبھی میں سچ سمجھتا تھا —— ——"

غلام اکبر نے زیرِ نظر کتاب میں یہ الفاظ لکھ کر گویا، اس پر تبصرے کا حق بھی ادا کر دیا ہے۔ اسلوب، اندازِ بیان، مواد، لہجے اور نظر کے زاویے سب ان الفاظ میں یکجا ہیں، اور کتاب کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یقیناً زیرِ نظر کتاب جذبات کی کہانی ہے۔ یہ کوئی تاریخی دستاویز تو نہیں، لیکن حقائق کی کہانی بھی ہے۔ غلام اکبر نے خطیبانہ لب و لہجے میں مسٹر بھٹو کے آغاز سے لے کر آج تک کے واقعات کو بیان کر دیا ہے۔ فاضل مصنف کے ہاں ایک للکار ہے۔ پھنکار ہے اور گونج گرج ہے۔ وہ مسٹر بھٹو سے اُمیدیں اور آرزوئیں وابستہ کئے تھا، اس نے اس شخص کو وہی سمجھا جو اس ملک کے لاکھوں رائے دہندگان نے سمجھا تھا اور غلام اکبر کا ہاتھ بھی

بھٹو کے اشارے پر کھڑا ہوا، زبان نے لبیک کہا' دل ان کے لئے دھڑکا' اور انہیں خوابوں کا شہزادہ بنا لیا۔ اس خوابوں کے شہزادے نے' خوابوں کو جس طرح تاراج کیا' غلام اکبر اس پر خاموش نہ رہ سکا' اس نے احتجاج کا نعرہ بلند کر دیا۔ غلام اکبر نے "لبیک" سے "احتجاج" تک جو سفر طے کیا، وہ بھی اس کے کروڑوں ہم وطنوں کا سفر ہے۔ اور غلام اکبر اسی سفر کی کہانی سنا رہا ہے۔ میرِ کارواں کے ہاتھوں کارواں کے لُٹنے کی کہانی اور میر کارواں کے لگائے ہوئے زخموں کی کہانی۔

غلام اکبر کی کہانی۔ جھوٹ کی سچی کہانی ہے' کہیں کہیں غلام اکبر کے ردِعمل' طرزِ احساس' طریقِ اظہار سے اختلاف ممکن ہے۔ لیکن ان کے خلوص کی بے پناہی سے انکار ممکن نہیں۔ وہ جارحیتوں کے انسان ہیں، مدافعتوں کے نہیں۔ وہ حملہ کرنے اور آگے بڑھنے پر یقین رکھتے ہیں۔ نشانہ بن کر بھاگ جانے کی صلاحیت ان میں نہیں۔ وہ روزانہ اخباروں کے ایڈیٹر بھی رہے' اور ہفت روزہ جرائد کے بھی۔ "اشتراک" اور "مصوّر" سے ان کی وابستگی کے معرکے اب بھی زندہ ہیں۔ فلمی دنیا میں بھی وہ پاکستان کا پرچم لے کر ڈٹ گئے اور ان کے نعرہ ہائے رستاخیز نے غیر پاکستانی روِیّوں کے خلاف وار پر وار کیا۔ وہ دنیائے صحافت میں مسلم قومیت کے علمبردار بنے اور مطالبہ کرتے رہے کہ ہندوستانی عزائم کے خلاف پوری قوم کو سیسہ پلائی دیوار بنا دیا جائے۔ ان کا اصرار ہے قوموں کی تعمیر کے لئے "نفرت" بہت ضروری ہے' دشمن سے نفرت اور شدید نفرت —— یہی نفرت "وحدتِ مقصد" پیدا کرتی ہے' اور اس "وحدتِ مقصد" سے اتحاد اور تنظیم کے سوتے پھوٹتے ہیں —— اور' سچ پوچھئے تو داخلی محاذ پر پھوٹ

ہمارا بہت بڑا دشمن ہے۔

"جھوٹ کا پیغمبر" ایک ایسی کتاب ہے جو جھوٹ کیخلاف نفرت ابھارتی، اور سچ کی صداقتوں کو ابھارتی ہے۔ جھوٹ نے جو جو ستم ڈھائے، غلام اکبر نے اس کی تفصیل بآوازِ بلند بیان کردی ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے صداقتوں کو بھی ابھارا ہے، اور اس شخصیت کو بھی جسے وہ اپنے خیال میں آج ان صداقتوں کا نشان سمجھتے ہیں ـــــ داغ داغ بھٹو کے ساتھ ساتھ وہ اُجلے اُجلے اصغر خان کی کہانی بھی سنا دیتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کی شدت پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے، وہ اس کی پرواہ نہیں کریں گے، کیونکہ ان کے ذہن میں جو دُھن سما جائے، وہ اسی دُھن میں گاتے، بڑھتے اور بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

غلام اکبر نے اپنی کتاب کا نام تجویز کر کے، ایک اور کتاب لکھ ڈالی ہے۔ "جھوٹ کا پیغمبر" ـــــ یہ تین الفاظ کیا ہیں، بھٹو کا مکمل ایکسرے ہیں۔ میں تو اس عنوان پر اس طرح جھوم اٹھا ہوں کہ اگر غلام اکبر صرف یہ عنوان ہی تجویز کر دیتے، تو بھی انہیں "صاحب کتاب" تسلیم کرنا پڑتا۔

مجیب الرحمٰن شامی

مُصنّف
ایگزیکٹو ایڈیٹر روزنامہ کوہستان ۱۹۶۴-۶۶ء
میگزین ایڈیٹر روزنامہ انجام ۱۹۶۶-۶۷ء
ریذیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ مشرق کراچی ۱۹۶۷-۶۸ء
چیف ایڈیٹر ویکلی مصتور ۱۹۶۸-۷۱ء
چیف ایڈیٹر ہفت روزہ اشتراک ۱۹۷۲-۷۳ء

یہ کوئی تاریخی دستاویز نہیں

یہ بھٹو کی داستانِ عروج و زوال بھی نہیں۔

یہ میری کہانی ہے

یہ میرے ہم وطنوں کی کہانی ہے۔

یہ میرے جذبات کی کہانی ہے۔

یہ میرے ہم وطنوں کے جذبات کی کہانی ہے۔

وُہ جذبات جنہیں بڑی چالاکی سے اُبھارا گیا۔

وُہ جذبات جنہیں بڑی بے دردی کے ساتھ کچل دیا گیا۔

وُہ جذبات جنہوں نے بھٹو کو بامِ عروج تک پہنچایا۔

وُہ جذبات جنہوں نے بھٹو کو قعرِ مذلت میں دھکیل دیا۔

وُہ جذبات جنہوں نے بھٹو کو میرِ کارواں بنایا۔

وُہ جذبات جنہوں نے بھٹو کو مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔

اپنے جذبات اور اپنے ہم وطنوں کے جذبات کی اس کہانی کو میں اصغر خان کے نام منسوب کرتا ہوں جنہوں نے چند برس قبل مجھ سے کہا تھا۔

"قوموں کی تقدیر بدلنے والے عہد آفرین لوگ جھوٹ کی کوکھ سے جنم نہیں لیا کرتے۔"

آج میں سوچ رہا ہوں کہ جھوٹ کی سیاہی سے لکھی جانے والی تاریخ حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہے اور حرف وہی ہمیشہ روشن رہتا ہے جسے لوگ اپنے خون سے لکھتے ہیں۔

بھٹو کے دورِ استبداد کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کے شہیدوں نے ثابت کر دیا کہ اصل طاقت بندوق پکڑنے والے کے ہاتھ میں نہیں گولی کھانے والے سینے میں ہوتی ہے۔
۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی صبح کو ظلمتوں بھری وہ طویل رات ختم ہو چکی تھی جس کا آغاز ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا تھا۔
اب یہ فرض جنرل ضیاء الحق پر عائد ہوتا ہے کہ ایسی کسی بھی رات کے اندھیروں کو پاکستان کی طرف بڑھنے نہ دیں۔ حکومتیں بدلتی رہتی ہیں لیکن قوموں کی تقدیر بدلنے والے لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں میری دعا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہو۔

غلام اکبر
۳ ستمبر ۱۹۷۷ء

# اعترافِ جرم

اس وحشیانہ نظام کا کوئی فرد ظالم اور مظلوم کے درمیان لڑی جانے والی جنگ میں مظلوم کی ڈھال بن کر اپنی کوکھ سے غداری نہیں کر سکتا۔

میں ایک مجرم ہوں۔

میرا جرم یہ ہے کہ میں نے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں بھٹو کو ووٹ دیا تھا اس وقت میرا تخیل بھٹو کو ایک ایسے پاکستان کے معمار کے روپ میں دیکھ رہا تھا جو عالمِ اسلام کا ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ بن چکا ہو اور جس کی عظمت کا پرچم مسلم قومیت کے دشمنوں کو للکار للکار کر کہہ رہا ہو کہ قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے خوابوں نے حقیقت کا جامہ پہن لیا ہے۔ میری چشمِ تصور بھٹو کو ملتِ پاک کے نجات دہندہ کا تاریخ ساز کردار ادا کرتے دیکھ رہی تھی۔ میرے نزدیک بھٹو ایک ایسی تلوار تھا، جو ظلم و بے انصافی، بھوک و جہالت اور استحصال و بے حسی کی زنجیریں کاٹ کر وطنِ عزیز کو معاشی عدل، معاشرتی مساوات اور سلطانیٔ جمہور کی حسین منزل کی طرف لے جانے کے لئے بلند ہوئی تھی۔

بھارت کی سامراجی ذہنیت کے خلاف ایک ہزار سال تک جہاد جاری رکھنے کا اعلان کرنے والا بھٹو ——— جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی چکی میں پسنے والے کروڑوں عوام کو معاشی اور معاشرتی انقلاب کا پیغام دینے والا بھٹو ——— ایک ساکت جامد اور بیمار معاشرے میں غریب عوام کی حاکمیت اور عزتِ نفس کی روح پھونک کر ایک نئے پاکستان کی تعمیر کا دعویٰ کرنے والا بھٹو ——— اس وقت

میرا ہیرو تھا۔ میں کسی بھی قیمت پر یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ کہ جاگیردارانہ نظام کی کوکھ سے ایک انقلاب آفرین اور عہد ساز شخصیت جنم نہیں لے سکتی۔ اگر میری آنکھوں پر میرے معصوم خوابوں نے خود فریبی اور خوش فہمی کا پردہ نہ ڈال رکھا ہوتا تو مجھے جان لینا چاہیئے تھا کہ جبر و استبداد پر مبنی جس نظام کی کوکھ سے بھٹو نے جنم لیا تھا اس نظام کی کوکھ سے آج تک کسی لینن، کسی ماؤزے تنگ کسی ڈیگال، کسی چرچل، کسی لنکن، کسی اتاترک، کسی ناصر اور کسی جناح نے جنم نہیں لیا۔ میں بھول گیا تھا کہ جس نظام کی بنیادیں محکوم انسانوں کی ہڈیوں پر قائم ہوئی ہوں اور جسے صدیوں سے غریبوں اور بے بسوں کے خون سے سینچا جا رہا ہو۔ اس وحشیانہ نظام کا کوئی فرد ظالم اور مظلوم کے درمیان لڑی جانے والی جنگ میں مظلوم کی ڈھال بن کر اپنی کوکھ سے غداری نہیں کر سکتا۔ میں یہ سوچنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے جس شخص نے ساری زندگی چاندی کے برتنوں میں کھانا کھایا ہو اسے کیا خبر کہ فاقہ کسے کہتے ہیں اور تنگ و تاریک اور شکستہ جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے شب و روز کیسی یاس زدہ بے بسی اور کسمپرسی میں گذرتے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلا رکھا تھا کہ لاڑکانہ کی شکارگاہوں میں پرورش پانے والا وڈیرہ زادہ وطن عزیز میں ایک ایسے معاشرے کی داغ بیل ڈالنے کے لئے قومی سیاست کے افق پر طلوع ہوا ہے۔ جس میں کسی کو بھی بھوک بیماری، افلاس، جہالت اور نا امیدی ورثے میں نہیں ملے گی اور جس کا ہر فرد اس ایقان کے ساتھ قومی زندگی میں اپنا کردار ادا کرے گا کہ اس کے معاشرتی اور قانونی حقوق کو تاراج کرنے والی قوتوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کچل دیا گیا ہے۔

اس وقت میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ہارورڈ یونیورسٹی کی رنگین فضاؤں سے بمبئی اور کراچی کے نائٹ کلبوں تک سفر کرنے والے جس رئیس زادے

کو میرا ذہن مستقبل کے پاکستان کا معمار قرار دے چکا ہے وہ میرے ہی ووٹ کی تلوار سے میرے ہی وطن کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والا ہے۔ میرے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ میرا ووٹ ایک ایسے طالع آزما پر اقتدار کے دروازے کھولنے والا ہے۔ جس کی پوری سیاسی شخصیت جھوٹ مکاری شعبدہ بازی ریاکاری اور ظلم و جبر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔

میں نے بھٹو کو ووٹ دے کر جو جرم کیا تھا اس پر میں نادم ہوں، شرمندہ ہوں میں یہ سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں کہ میرے اس جرم کا کفارہ ادا کرنے کے لئے میرے ہم وطنوں کو کراچی سے خیبر تک اپنا خون بہانا پڑا ہے۔ وہ خون بڑا ہی مقدس، بڑا ہی عظیم تھا جو بھٹو کے ناقابلِ تصور جبر و استبداد ــــ بھٹو کی وحشیانہ ہوسِ اقتدار اور بھٹو کی خون آشام سنگینوں کے خلاف ملتِ پاک کے جیالے فرزندوں اور غیور بیٹیوں نے ملک کے چپے چپے پر بہایا۔ وہ ہزاروں جھوٹ جو بھٹو کے دورِ اقتدار میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بولے گئے۔ اخبارات کے صفحات پر لکھے اور لکھوائے گئے وہ سب جھوٹ بالآخر اس ایک عظیم سچائی کے سامنے دم توڑ گئے جو تحریک جمہوریت کے شہیدوں نے اپنے مقدس خون سے لکھی۔ جھوٹ کی عمر زیادہ سے زیادہ اتنی لمبی ہو سکتی ہے۔ جتنی لمبی عمر بھٹو کے اقتدار کی تھی۔ لیکن سچائی کی جنگ ابھی تک پوری طرح جیتی نہیں گئی۔ جھوٹ کی طاقت پر اندھا بھرا ایمان رکھنے والا بھٹو اب بھی سونے چاندی کے انباروں پر کھڑا ہو کر چیخ رہا ہے کہ: "میں غریبوں کا ساتھی ہوں عوام کا دوست ہوں، مزدوروں کا بھائی ہوں۔ کسانوں کا خادم ہوں"۔

بھٹو کو اب بھی یقین ہے کہ اس کے جھوٹ کو شکست نہیں ہوئی۔ وہ دوبارہ پاکستان کے عوام کے ساتھ فراڈ کر سکتا ہے۔ وہ دوبارہ غریبوں کو فریب دے سکتا ہے۔ وہ دوبارہ مزدوروں اور کسانوں کو بے وقوف بنا سکتا ہے۔ وہ دوبارہ جبر و استبداد

کی اس کرسی پر قابض ہو سکتا ہے۔ جس کی مضبوطی پر اسے بڑا ناز تھا اور جس پر بیٹھ کر اس نے اپنی بندوقوں کا رخ عوام کی طرف موڑ دیا تھا۔

بھٹو کی مجنونانہ ہوسِ اقتدار کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ تخت و تاج تک پہنچنے کے لئے اس نے آدھا ملک کاٹ کر بھارت کی آغوش میں پھینک دیا تھا۔ اس کے باوجود اسے تاج و تخت نہ ملتا تو صرف لاڑکانہ کا فرمانروا بننے کے لئے وہ باقی ملک کی سلامتی کو بھی داؤ پر لگا دیتا۔

مجھے احساس ہے کہ میرا لب و لہجہ بہت زیادہ غیر مہذب ہو گیا ہے۔ کسی بھی بڑے صحافی یا ادیب کو زیب نہیں دیتا کہ وہ قومی معاملات اور قومی شخصیات پر اظہار خیال کرتے وقت اس قسم کا غیر مہذب لب و لہجہ اختیار کرے۔ لیکن اگر میں صحافی ہوں تو بہت ہی چھوٹا صحافی ہوں۔ اگر ادیب ہوں تو بہت ہی چھوٹا ادیب ہوں۔ وہ خواب بہت ہی بڑے تھے جو میں بچپن سے ہی اپنے پاکستان کے بارے میں دیکھتا چلا آیا تھا۔ میرا وہ پاکستان بہت ہی بڑا تھا جس کا سبز ہلالی پرچم کراچی سے ڈھاکہ تک دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے اتحاد تنظیم اور یقین محکم کا پیغام بنا ہوا تھا۔ اپنے ان ہی خوابوں کی خاطر اپنے اسی پاکستان کے لئے میں نے ذوالفقار علی بھٹو کو اپنا ہیرو بنایا تھا اور میں اپنی روح کی ان چیخوں کو کبھی نہیں بھول سکتا جو ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بلند ہوئی تھیں۔ جب مسلم نشاہ ثانیہ کے جانباز سپاہی ڈھاکہ میں جگجیت سنگھ اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال رہے تھے۔ میرے خواب ٹوٹ چکے تھے۔ میرا پاکستان ٹوٹ چکا تھا۔ شاہنواز بھٹو کا ذہین بیٹا بڑی فاتحانہ شان کے ساتھ نیو یارک سے اسلام آباد پہنچنے والا تھا۔ پاکستان کی سرحدیں سمٹ چکی تھیں لاڑکانہ کے وڈیرے کی جاگیر کی سرحدیں پھیل گئی تھیں۔ اکیس توپوں کی سلامی لینے کے جنون نے میرے ہیرو کو میرے خوابوں کا قاتل بنا دیا تھا۔ اگر میں اپنے خوابوں

کے قاتل کے متعلق مہذب لب و لہجہ میں بات نہیں کر سکتا تو مجھے معاف کر دیا جائے۔

○ ○
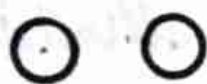
دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی عظمت کا پرچم بلند کرنے والی قوم کی تاریخ میں جہاں فتح و نصرت کی ناقابل یقین داستانیں لکھی گئی ہیں وہاں اسے ہزیمت پسپائی اور ذلت و رسوائی کی طویل اور تاریک راتوں سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ وہ رات کتنی تاریک ہو گی۔ جب فرڈی ننڈ کا لشکر غرناطہ کی فصیلیں توڑ کر الحمرا کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس رات کی ظلمتیں کس قدر ہولناک ہوں گی جب بغداد کی حرمت تاتاریوں کے نیزوں پر اچھالی جا رہی تھی۔ ہماری تاریخ کی پیشانی پر اندھیروں بھری اس رات کی سیاہی بھی لگی ہوئی ہے۔ جب بیت المقدس کی فضاؤں میں ہلالی پرچم کی جگہ صلیب نے لے لی تھی۔ شاید ہی کسی قوم کی تاریخ میں اتنے عظیم تضادات ملیں گے۔ جتنے عظیم تضادات ہماری تاریخ میں ملتے ہیں۔ جس لشکر نے جبل الطارق پر اترنے کے بعد اپنی کشتیاں صرف اس لئے جلا ڈالی تھیں کہ پسپائی کا کوئی راستہ ہی نہ رہے وہ بھی اسی قوم کا لشکر تھا جو نصف دنیا پر حکومت کرنے کے بعد ہسپانیہ میں چند ہزار نصرانیوں اور خوارزم میں چند ہزار تاتاریوں کے ہاتھوں گاجر مولی کی طرح کاٹ دی گئی۔ جس قوم کے چند ہزار سپاہیوں نے صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں یورپ کی تمام بڑی طاقتوں کی اجتماعی قوت کو کچل کر رکھ دیا تھا اسی قوم کے بارہ کروڑ عوام صرف تیس لاکھ یہودیوں کے ہاتھوں شکستوں پر شکستیں کھا رہے ہیں۔

ہماری تاریخ میں ایسے بیشمار المیئے ملیں گے۔ جن پر مشرق سے مغرب تک جرأت و شجاعت اور نصرت و کامرانی کی لازوال داستانیں رقم کرنے والی قوم خون کے آنسو بہا سکتی ہے۔ لیکن شاید ہی کوئی المیہ اتنا شرمناک اور کرب انگیز ہوگا۔ جتنے شرمناک اور کرب انگیز المیئے نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں جنم لیا ہماری تاریخ کی شاید ہی کسی رات کے اندھیرے اس قدر ہولناک ہوں گے۔ جس قدر ہولناک اندھیروں سے ہمیں ان چند لمحات کے دوران گزرنا پڑا۔ جب آل انڈیا ریڈیو سے یہ اعلان ہو رہا تھا کہ محمود غزنوی کے جانشینوں نے اندرا گاندھی کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

یہ المیہ کسی بھی غیور قوم پر سکتہ طاری کرنے کے لیئے کافی تھا اور مجھے یقین ہے کہ ظلمت بھری اس رات کو قوم کے ہر ایسے فرد پر سکتہ ضرور طاری ہوا ہوگا۔ جس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کا رشتہ غزنویؒ، غوریؒ، بابرؒ، عالمگیرؒ اور ٹیپوؒ کے خون سے نہیں ٹوٹا اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جب یہ سکتہ ٹوٹا ہوگا، تو قومی غیرت رکھنے والے ہر شخص کے دل میں انتقام کی چنگاری ضرور پیدا ہوئی ہوگی قومی انا کا مطلب سمجھنے والے ہر فرد کی روح کی گہرائیوں سے یہ امنگ ضرور ابھری ہوگی کہ سقوطِ ڈھاکہ نے اہل پاکستان پر ذلتوں اور رسوائیوں کے جو داغ لگائے ہیں انہیں مٹانے کے لیئے قوم اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کے سانچے میں ڈھل جائے۔ لیکن قائدِ اعظم کے پاکستان کو سقوط ڈھاکہ کے المیئے کی طرف لے جانے والے قائد عوام کے عزائم کچھ اور تھے۔

بھٹو اور ان کے حواری اپنے "کارناموں" پر "خراج تحسین" حاصل کرنے کے لیئے اکثر یہ کہتے رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی کو اقتدار انتہائی نامساعد حالات میں ملا تھا۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیئے نے قوم کو بے جان کر کے رکھ دیا تھا۔

قومی معیشت کا پہیہ رک گیا تھا۔ قوم پر خود اعتمادی کے فقدان بے یقینی اور احساس بے چارگی کے منحوس سائے منڈلا رہے تھے۔ ملک کی کشتی ایک خطرناک بھنور میں پھنس چکی تھی۔ یہ صرف بھٹو کی "ولولہ انگیز قیادت" اور "بے مثال فہم و فراست" کا کمال ہے کہ دنیا کے نقشے پر اب بھی پاکستان کا نام نظر آرہا ہے۔

اس قسم کے دلائل پیش کرنے کا مقصد ہماری قومی غیرت کا مذاق اڑانے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ جن حالات میں بھٹو اور ان کے حواری بر سر اقتدار آئے ان حالات کے بغیر پیپلز پارٹی کو اقتدار مل بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں سقوطِ مشرقی پاکستان کا المیہ بھٹو کے لئے اقتدار کا زینہ ثابت ہوا۔ یعنی اقتدار کی کرسی تک پہنچنے کے لئے بھٹو نے ایسے حالات پیدا کئے کہ سقوطِ مشرقی پاکستان ناگزیر ہوگیا۔ ابتدا میں جب بھٹو پر یہ سنگین الزام لگایا گیا تھا تو میرے دل نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ بھٹو میرا ہیرو رہ چکا تھا۔ لیکن جب میں نے دماغ سے کام لینا شروع کیا تو تمام واقعاتی شہادتیں مجھے اسی نتیجے کی طرف لے گئیں کہ لاڑکانہ کے جاگیردار نے اسلام آباد کے قصرِ صدارت میں داخل ہونے کے لئے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ڈھاکہ کی قربانی دی تھی۔ بہر حال اس موضوع پر روشنی میں آگے چل کر ڈالوں گا۔

یہاں صرف یہ موقف اختیار کرنا چاہتا ہوں کہ جن "نامساعد" حالات میں بھٹو نے ملک کی قیادت سنبھالی وہ قوم کو اوجِ ثریا تک لے جانے کے لئے انتہائی سازگار تھے ایسے حالات میں اقتدار حاصل کرنے کی خوش نصیبی بہت ہی کم لیڈروں کو حاصل ہوئی ہے۔

قوم کی رگ رگ میں انتقام کی چنگاری بھڑک رہی تھی۔ ذلت و رسوائی کا جو داغ سقوطِ ڈھاکہ نے قوم کی پیشانی پر لگایا تھا اُسے دھونے کے لئے

ہر فرد بے چین تھا۔ بڑی سے بڑی قربانی دے کر قومی وقار بحال کرنے کا جذبہ قوم میں جس قدر شدید ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات کو تھا اس قدر شاید دوبارہ کبھی نہ ہو۔ صلاح الدین ایوبیؒ جیسے قائدین کو ایسے ہی حالات جنم دیتے ہیں۔
لیکن ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی کوکھ سے جنم لینے والا قائد ایوبیؒ نہیں بھٹو تھا۔ میں جانتا ہوں کہ ایوبیؒ اور بھٹو کا ایک ضمن میں ذکر کرنا یروشلم کے فاتح کی توہین ہے۔ بھٹو اور ایوبیؒ کے درمیان جتنا بڑا فاصلہ تاریخ کا ہے اس سے کہیں بڑا فاصلہ کردار کا ہے۔ یہاں میرا مقصد صرف یہ کہنا ہے کہ ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات کو بھٹو کی بجائے ایوبی کا ظہور بھی ہو سکتا تھا۔
اس کے باوجود مجھے اور میری قوم کو بھٹو سے کچھ توقعات تھیں، کچھ امیدیں تھیں، ایک خیال تھا کہ بھٹو سقوطِ مشرقی پاکستان کا چیلنج قبول کریگا اور پوری قوم کو عزم و عمل، اتحاد و تنظیم، ایقان و اخلاق کے ہتھیاروں سے مسلح کر دیا جاتے گا۔ ہم اپنے خون اور پسینے سے ایسی بجلیاں پیدا کریں گے جو دشمن پر قہرِ الٰہی بن کر گریں گی اور جن کی گرج پوری دنیا کو بتا دے گی کہ سقوطِ ڈھاکہ کو مسلم قوم کا مقدر سمجھنے والوں نے فاروق اعظمؓ کے جانشینوں کی غیرت کے بارے میں غلط اندازے لگائے ہیں۔
یہ میرا اور میری قوم کا خیالِ خام تھا۔ اپنی پہلی ہی تقریر میں بھٹو نے آدھے پاکستان کو نئے پاکستان کا نام دے کر ہمیں واضح طور پر بتا دیا کہ مشرقی پاکستان کو آئندہ مسلم بنگال کے نام سے یاد کیا جاتے۔ کیا بھٹو واشنگٹن سے ہی یہ طے کر کے آیا تھا کہ اب مشرقی پاکستان کو مملکتِ خداداد پاکستان کا حصہ تصور نہ کیا جاتے۔ مشرقی پاکستان اب مشرقی پاکستان نہیں رہا مسلم بنگال بن گیا ہے۔؟ کیا بھٹو سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے ہی مشرقی پاکستان کی علیحدگی

کو ایک مستقل حقیقت کے طور پر تسلیم کر چکا تھا ؟ بظاہر یہ سوالات بڑی سطحی اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر ان سے بھٹو کی ذہنی کیفیات کی بڑی واضح عکاسی ہوتی ہے۔ قوم ابھی تک مشرقی پاکستان کو مشرقی پاکستان کہنے کی عادت ترک نہیں کر سکی اور بھٹو نے چند ہی گھنٹوں میں "مسلم بنگال" کی اصطلاح استعمال کرنی شروع کر دی تھی۔ جو لوگ بھٹو کے "اصلی چہرے" کو ابھی تک نہیں دیکھ سکے وہ شاید میری اس بات کو ایک سطحی اور بے وزن اعتراض قرار دیں۔ مگر ایسے لوگوں سے میں یہ پوچھنے کی جسارت کروں گا کہ اگر باقیماندہ پاکستان کے خلاف دوبارہ کوئی سازش ہو، کسی صوبے کو اسی طرح پاکستان سے الگ کر دیا جائے۔ جس طرح مشرقی پاکستان کو الگ کیا گیا اور پھر کوئی اور بھٹو اٹھے اور فوراً ہی اس صوبے کو مسلم سندھ یا مسلم پنجاب کا نام عطا کر کے علیحدگی کے عمل کو علانیہ طور پر قبول کر لے تو کیا ایسی ذہنیت کو حب الوطنی کے کسی بھی معیار پر پرکھا جا سکے گا۔ اگر یہ حب الوطنی ہے تو پھر غداری کسے کہتے ہیں ؟

یہاں میں لارنس آف عریبیا کا ذکر ضرور کروں گا جو عربوں کا ہمدرد بن کر مشرقِ وسطیٰ کی سیاست میں داخل ہوا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کی وحدت اور سالمیت پر کاری ضرب لگانے کے لئے اس نے عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کیا۔ ترکوں کو شکست ہوئی اور دنیائے عرب چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں میں بٹ گئی۔ اس لحاظ سے بھٹو کو "لارنس آف پاکستان" قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لارنس آف عریبیا نے جو کچھ بھی کیا حکومت برطانیہ کے ایجنٹ اور ایک محب وطن انگریز کی حیثیت سے کیا۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان کو "مسلم بنگال" بنوانے والے بھٹو کے سامنے ذاتی ہوسِ اقتدار کی تکمیل کے سوا کوئی مقصد نہیں تھا۔ اگر بھٹو بھی کسی ملک یا حکومت کا اسی طرح وفادار ہوتا جس طرح لارنس تاجِ برطانیہ کا وفادار تھا تو

میری نظروں میں اس کا مقام بہت بلند ہوتا، لیکن بھٹو نے جو کچھ بھی کیا اسلام آباد کے تخت پر قبضہ کرنے کے لئے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا موازنہ ہسپانیہ کے آخری مسلمان حکمران ابوعبداللہ سے کرتا ہوں جس نے غرناطہ کے تخت پر قبضہ کرنے کے لئے اپنے باپ کی آنکھیں نکلوا دی تھیں اور پھر اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لالچ میں جس نے غرناطہ کے دروازے فرڈی ننڈ کے لشکر پر کھول دیئے تھے اقتدار پرستی کے جنون میں بہت سے لوگوں نے بہت بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کیا ہوگا، لیکن لاڑکانہ کا وڈیرہ اس میدان میں سب سے آگے نکل گیا اس نے "جرم" کو سیاسی حکمت عملی کا درجہ دے کر اپنے جرائم کو سیاسی کارناموں کے طور پر پیش کیا۔ میرے نزدیک سقوطِ مشرقی پاکستان کے لئے "سازگار" حالات پیدا کرنا ایک جرم سہی لیکن بھٹو کے نزدیک یہ ایک سیاسی کارنامہ تھا کہ اس کے بغیر اسلام آباد کے تخت تک رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ سیاسی کارنامہ انجام دینے کے لئے بھٹو نے یقیناً بڑا ہی "مکمل" منصوبہ بنایا تھا۔ اتنا مکمل کہ بھٹو کو شروع سے ہی اس کی کامیابی کا یقین تھا۔

نومبر ۱۹۷۰ء کے اوائل میں جب جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کے تحت عام انتخابات کی مہم عروج پر تھی تو بھٹو نے اپنے ایک قریبی ساتھی سے کہا تھا۔

"ایک سال کے اندر حکومت کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔؟ ہم زیادہ سے زیادہ پنجاب اور سندھ میں اقتدار حاصل کر سکتے ہیں۔ مشرقی پاکستان سے ہم نے انتخابات میں حصہ ہی نہیں لیا اور بلوچستان اور سرحد میں ہماری پوزیشن کمزور ہے۔" اس قریبی ساتھی نے جواب دیا تھا۔ "قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔"

بھٹو اپنے ساتھی کی یہ بات سن کر مسکرایا تھا اور پھر اس نے کہا تھا۔

"تم دیکھتے جاؤ کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ اصل طاقت پنجاب کی ہے اور پنجاب ہمارے ساتھ ہے"

حالات نے جو رُخ اختیار کیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ بھٹو کا وہ ساتھی اس وقت سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے "قائدِ عوام" کی سیاسی حکمتِ عملی مملکتِ خداداد پاکستان پر کتنے بڑے المیے کے دروازے کھولنے والی ہے۔ بعد میں جب وہ فاتح اسلام آباد کے عتاب کا نشانہ بن کر جیل گیا تو اسے بھٹو کی پیشگوئی ضرور یاد آئی ہوگی اور اس نے یقیناً سوچا ہوگا کہ "جو شخص اپنی سیاسی حکمتِ عملی سے ملک کو توڑ کر ایک حصہ پر قبضہ کر سکتا ہے اس کے لئے اپنے ایک قریبی ساتھی کو جیل بھجوانا اور تشدد کا نشانہ بنوانا تو بہت ہی معمولی بات ہے۔"

---

# اصغر خان کا جال

سیاسی حکمت عملی
کا ماہر جس قبر میں
جمہوریت کو دفن کرنا
چاہتا تھا۔ اس میں خود
دفن ہونے والا تھا۔

بھٹو کو "سیاسی حکمت عملی" تیار کرنے کا ماہر تصور کیا جاتا ہے۔ اس بات سے میں بھی انکار نہیں کروں گا۔ لیکن سیاسی حکمت عملی کے دو مفہوم ہیں۔ ایک مفہوم کا تعلق ذہانت سے ہے، فراست سے ہے، بصیرت سے، تدبر سے اور دانشمندی سے ہے۔ دوسرے مفہوم کا تعلق مکاری سے، چالاکی سے، ریاکاری سے مفاد پرستی سے اور خودغرضی سے ہے۔ بھٹو میں ذہانت نہیں ہے۔ فراست نہیں ہے۔ بصیرت نہیں ہے۔ تدبر نہیں ہے اور دانش مندی نہیں ہے۔ بھٹو میں مکاری ہے۔ چالاکی ہے۔ ریاکاری ہے۔ مفاد پرستی اور خودغرضی ہے۔

اپنی اس بات کے حق میں، میں دو واضح مثالیں دے سکتا ہوں۔ جب جنرل یحییٰ خاں نے سیاسی مذاکرات کی ناکامی کے بعد مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا حکم دیا تھا تو بھٹو اس وقت ڈھاکہ میں تھا۔ ڈھاکہ سے کراچی آنے کے بعد اس نے بے شمار اخبار نویسوں کے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ "خدا نے پاکستان کو بچا لیا ہے۔" بھٹو کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کی سالمیت کو بچانے کے لئے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی ضروری تھی۔ ایک عام اور اوسط درجے کا ذہن رکھنے والے آدمی کا تبصرہ یقیناً یہی ہونا چاہیئے تھا، لیکن بھٹو کو تو تمام حالات کا علم تھا۔ کیا وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان میں فوجی

کارروائی کا انجام کیا ہوگا؟ ذہانت، فراست، بصیرت، تدبر اور دانشمندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ آنے والی تباہی بھٹو پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی۔ اگر آنے والی تباہی بھٹو پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھی تو اس نے یہ کیوں کہا کہ "خدا نے پاکستان کو بچا لیا ہے"۔ ظاہر ہے کہ بھٹو کے پاس یا تو ذہانت، فراست، بصیرت تدبر اور دانشمندی تھی ہی نہیں یا پھر اس نے جان بوجھ کر پاکستان کے عوام کو آنے والی تباہی سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی، دوسرے الفاظ میں اس نے مکاری، چالاکی، ریاکاری مفاد پرستی اور خود غرضی سے کام لیا۔

دوسری مثال میں مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کی دوں گا

۱۹۷۶ء کے اواخر میں جب بھٹو نے قبل از وقت عام انتخابات منعقد کرانے کے فیصلے کا اعلان کیا تو بظاہر حزبِ اختلاف کی پوزیشن بہت کمزور نظر آتی تھی۔ اپوزیشن پارٹیوں کا شیرازہ بکھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ لگتا تھا کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کی طاقت کے سامنے اپوزیشن لیڈروں کے حوصلے جواب دے چکے ہیں اور وہ بھٹو کی بے انداز قوت سے ٹکرانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ویسے بھی اپوزیشن دو دھڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف تحریک استقلال اور جمعیت العلمائے پاکستان کا اتحاد تھا اور دوسری طرف باقی جماعتوں کا متحدہ جمہوری محاذ۔ ان دو گروپوں میں اشتراکِ عمل کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی تھی کیونکہ متحدہ جمہوری محاذ کے بعض لیڈر تحریک استقلال کے صدر کی قد آور شخصیت سے خوف محسوس کرتے تھے

بھٹو نے ان تمام باتوں کو مدِ نظر رکھ کر انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ شخصیات اور نظریات کا تضاد اور تصادم اپوزیشن پارٹیوں کو ایک جھنڈے تلے متحد نہیں ہونے دے گا۔ انتخابات کے اعلان سے پہلے بھٹو نے اپنا "عوامی امیج" بحال کرنے کے لئے متعدد اقدامات کر لئے تھے۔ کسانوں کا ہفتہ

منایا گیا تھا۔ مزدوروں کا ہفتہ منایا گیا تھا، خواتین کا ہفتہ منایا گیا تھا، اقلیتوں کا ہفتہ منایا گیا تھا۔ متعدد ہفتوں کے علاوہ زرعی اصلاحات کا ڈھونگ بھی ایک بار پھر رچایا جا چکا تھا۔ ان زرعی اصلاحات کی حقیقت کیا تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف گزشتہ سال کی فصل خریف سے بھٹو نے چالیس لاکھ روپے کا دھان رائس ملنگ کارپوریشن کو فروخت کیا۔ صرف دو سو ایکڑ زمین سے بھٹو نے اتنی بڑی فصل کیسے اگائی یہ راز صرف بھٹو ہی جانتا ہے۔ یا پھر وہ تمام جاگیردار اور وڈیرے جو زرعی اصلاحات کے باوجود ابھی تک ہزاروں لاکھوں ایکڑ زمین کے مالک ہیں۔ بہرحال ضروری نہیں کہ جن اصلاحات کا اعلان ہوا انہیں عملاً بھی نافذ کیا جائے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔ زرعی اصلاحات کا ڈھونگ بھٹو نے صرف یہ تاثر دینے کے لئے رچایا تھا کہ وہ غریب کسانوں کا کتنا بڑا ہمدرد ہے۔

پڑھی لکھی رائے عامہ کو بے وقوف بنانے کے لئے بھی بھٹو نے کچھ سٹنٹ تیار کر لئے تھے۔ ایک سٹنٹ "تھرڈ ورلڈ" کا تھا۔ جس کی تشہیر کچھ اتنے بڑے پیمانے پر کی گئی جیسے تیسری دنیا کے ممالک نے نہ صرف یہ کہ بھٹو کو اپنا لیڈر بنا لیا تھا، بلکہ یہ تہیہ بھی کر لیا تھا کہ وہ بھٹو کی قیادت میں طاقت کے دونوں بڑے بلاکوں کو ناکوں چنے چبوا دیں گے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تربیت یافتہ طوطے بس ایک ہی سبق دہراتے تھے کہ بھٹو نے صرف ایک مضمون لکھ کر تھرڈ ورلڈ میں جان ڈال دی ہے اور جب وہ تھرڈ ورلڈ کے ممالک کی کانفرنس بلائے گا تو واشنگٹن کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ لندن میں بھونچال آ جائے گا اور ماسکو پر لرزہ طاری ہو جائے گا۔ اس سارے پروپیگنڈے کا مقصد ملکی رائے عامہ پر یہ تاثر قائم کرنا تھا کہ بھٹو کی بین الاقوامی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ عالمی سیاست اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی

بھٹو بنیادی طور پر ایک ایسا نفسیاتی مریض ہے جو خود ہی اپنی عظمت کا بت بناتا ہے اور پھر خود ہی اسے پوجنا شروع کر دیتا ہے۔ اس بت کو زیادہ بلند و بالا اور پُرشکوہ بنانے کے لئے وہ اکثر دوسروں کے نظریات چرا کر اپنے نام کے ساتھ وابستہ کر لیتا ہے۔ تھرڈ ورلڈ کی بات تو بنڈونگ کانفرنس کے ساتھ ہی چل نکلی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب بھٹو کو صرف اس کے قریبی دوست اور رشتہ دار جانتے تھے یا پھر کراچی اور بمبئی کے نائٹ کلبوں میں رقص و شراب کی محفلیں سجانے اور گرمانے والے امراء اور رنگیلے لوگ۔

اپنا "انٹرنیشنل امیج" بنا کر اسے ملکی رائے عامہ پر مسلط کرنے کی کوشش میں بھٹو نے بعض طفلانہ حرکتیں بھی کی ہیں۔ اس سلسلہ میں یونان کے وزیر اعظم کرمانولس کے دورۂ پاکستان کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس دورے کی "اہمیت" اجاگر کرنے کے لئے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ بھٹو اور یونانی وزیر اعظم کے درمیان بڑے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ یہ "دوستانہ تعلقات" اس زمانے میں قائم ہوئے تھے، جب یونانی وزیر اعظم پیرس میں جلاوطنی کی زندگی بسر رہا تھا۔ ان "دوستانہ تعلقات" کے حوالے سے کئے جانے والے پروپیگنڈے کی تفہیم یہ تھی کہ ترکی سے پاکستان کے خصوصی تعلقات کے پیش نظر، یونانی وزیر اعظم جناب بھٹو سے یہ درخواست کرنے آیا ہے کہ قبرص کے مسئلہ پر پاکستان، ترکی اور یونان کے درمیان مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرے۔ مقصد اس پروپیگنڈے کا یہ تاثر پیدا کرنا تھا کہ بھٹو کی شخصیت بین الاقوامی سطح پر اتنی اہم ہے کہ جس مشن میں امریکہ اور اقوام متحدہ کو ناکامی ہو چکی تھی اسے بھٹو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ کتنا مضحکہ خیز تھا یہ سٹنٹ! کون نہیں جانتا کہ مصالحت کنندہ کا کردار صرف وہی شخص یا ملک ادا کر سکتا ہے۔ جو تصفیہ طلب مسئلہ پر معقول حد تک غیر جانبدار ہو۔ ترکی کے ساتھ پاکستان کے تعلقات

کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ قبرص کے مسئلہ پر پاکستان کے غیر جانبدار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یونانی وزیر اعظم کو بھلا کس پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ وہ ترکی کے ایک حلیف سے مصالحت کنندہ بننے کی درخواست کرے۔؟

کہا جاتا ہے کہ خود بھٹو نے یونانی وزیر اعظم سے درخواست کی تھی کہ اسے قبرص کے معاملے میں اپنی "سفارتی مہارت" استعمال کرنے کا موقع دیا جائے۔ اگر تجرباتی طور پر بھی بھٹو کو یہ موقع مل جاتا تو وہ چند ہفتوں کے لئے عالمی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتا اور پھر ریڈیو، ٹی وی اور پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے ذریعے یہ پروپیگنڈہ شروع ہو جاتا کہ بھٹو کی وجہ سے پاکستان کا وقار دنیا بھر میں بہت بلند ہو گیا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ یونانی وزیر اعظم نے عالمی سطح پر اس قسم کی طفلانہ کامیڈی میں ملوث ہونا پسند نہ کیا اور یوں بھٹو کا یہ ایڈ ونچر ادھورا رہ گیا۔

بہر حال رائے عامہ پر اپنی حب الوطنی اور قوم پرستی کا سکہ جمانے کے لئے بھٹو نے "ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ" والے معاملے کو خاصی پبلسٹی دے رکھی تھی۔ تاکہ بوقت ضرورت اسے سٹنٹ کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

○ ○

بھٹو انتخابات کے لئے اپنے حق میں سازگار فضا پیدا کر چکا تھا۔ اس نے تمام امکانات کا خاکہ بھی اپنے ذہن میں تیار کر لیا تھا۔ یہ خاکہ کچھ اس طرح تھا۔

۱۔ تحریک استقلال اور جمعیت العلمائے پاکستان کے اتحاد اور متحدہ جمہوری محاذ کے درمیان سمجھوتہ نہیں ہو گا۔

۲۔ تحریک استقلال کے قائد اصغر خاں انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے حق

ہیں مہم چلائیں گے اور متحدہ جمہوری محاذ اسمبلیوں میں اپنی پوزیشن زیادہ مستحکم کرنے کی امید پر انتخابات کا چیلنج قبول کرے گا۔

۳۔ اگر تحریک استقلال کے گروپ اور متحدہ جمہوری محاذ میں سمجھوتہ ہوا بھی تو اس کی بنیادیں اتنی کمزور ہوں گی کہ انہیں بڑی آسانی کے ساتھ ہلایا جا سکے گا

۴۔ تحریک استقلال کے گروپ اور متحدہ جمہوری محاذ کے درمیان انتخابی سمجھوتے کی صورت میں بڑی کامیابی سے پروپیگنڈہ کیا جا سکے گا کہ اتنے سارے متضاد عناصر کا اتحاد "بھٹو دشمنی" کی حد تک تو قائم رہ سکتا ہے لیکن برسر اقتدار آنے کی صورت میں فوراً ٹوٹ جائے گا اور ملک ایک خوفناک سیاسی بحران کا شکار ہونے سے نہیں بچ سکے گا۔

۵۔ اگر اپوزیشن حقیقتاً متحد ہونے میں کامیاب ہو گئی تو بھی رائے عامہ اپنے حق میں ہموار کرنے کے لئے اس کے پاس نہ تو پیپلز پارٹی جیسے وسائل ہوں گے اور نہ ہی اتنا وقت ہوگا کہ وہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کی موجودگی میں مؤثر سیاسی طاقت بن سکے۔

ان تمام امکانات کی روشنی میں بھٹو کے لئے انتخابات جیتنا اور واضح اکثریت سے جیتنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ مگر ہوا یہ کہ بھٹو کے بعض اندازے یکسر غلط ثابت ہوتے! ادھر بھٹو نے انتخابات کا اعلان کیا اور ادھر اصغر خان اور متحدہ جمہوری محاذ جو ایک دوسرے سے کوسوں دور نظر آتے تھے۔ یکایک ہاتھ پھیلا کر ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ فاصلے بڑی تیزی کے ساتھ سمٹنے لگے۔ اپوزیشن کے تمام لیڈروں کے درمیان اچانک ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان قومی اتحاد قائم ہو گیا۔ بھٹو کے لئے یہ صورت حال قطعی طور پر غیر متوقع تھی۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلا رکھا تھا کہ پاکستان جمہوری پارٹی کے قیام کا راستہ ہموار کرنے

کے لئے جسٹس پارٹی کو توڑ کر اصغر خاں نے اپنی ابھرتی ہوئی سیاسی قوت کو جو نقصان پہنچایا تھا اس کے پیش نظر تحریک استقلال کا قائد دوبارہ اپنے آپ کو متحدہ جمہوری محاذ کے پیشہ ور سیاست بازوں کے رحم وکرم پر چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیگا اصغر خاں نے اچانک متحدہ اپوزیشن کا داعی بن کر بھٹو کے اس یقین کو پاش پاش کر دیا۔ پاکستان قومی اتحاد کے قیام نے پہلی بار بھٹو کو احساس دلایا کہ انتخابات وہ اتنی آسانی کے ساتھ نہیں جیت سکے گا جتنی آسانی کے ساتھ اس نے سوچ رکھا تھا۔ بھٹو اچانک جس پریشان کن صورت حال سے دوچار ہو گیا تھا اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اصغر خاں نے کہا۔

"ہمارا اتحاد بہت پہلے قائم ہو چکا تھا۔ چند مہینوں سے بھٹو جو اقدامات کر رہا تھا ان سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ انتخابات کرانے کا فیصلہ کر چکا ہے اور انتخابات جیتنے کے لئے راہ ہموار کر رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی خفیہ طور پر فیصلہ کر لیا کہ متحد ہو کر بھٹو کا مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے اپنے اتحاد کو خفیہ رکھنے کے لئے اتنی زبردست احتیاط برتی کہ بھٹو کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہوئی۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ ہم سب پاکستان کو بھٹو کے ظلم واستبداد سے نجات دلانے کے لئے متحد ہو گئے ہیں تو وہ کبھی انتخابات کرانے کا اعلان نہ کرتا۔ اب بھٹو اس اعلان سے واپس نہیں جا سکتا۔ ہمارا اتحاد اس کی پہلی شکست ہے"

پاکستان قومی اتحاد کا قیام در حقیقت بھٹو کی پہلی شکست تھی

لیکن جس بات نے بھٹو کو بری طرح بوکھلا دیا وہ انتخابات کے بارے میں اصغر خان کا غیر متوقع مؤقف تھا۔ اصغر خاں نے اس سے پہلے یہ مؤقف اختیار کر رکھا تھا کہ بھٹو حکومت کی نگرانی میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لینا بالکل بے سود بات ہو گی۔ کیونکہ ایسے انتخابات ہرگز آزادانہ اور منصفانہ

نہیں ہوں گے اور انہیں برسر اقتدار پارٹی فراڈ اور دھاندلی کے ذریعے جیت جائیگی۔ لیکن جب بھٹو کی خواہشات اور توقعات کے برعکس پاکستان قومی اتحاد قائم ہو گیا تو اصغر خاں اچانک اس امر کے داعی بن گئے کہ انتخابات میں بھٹو کا مقابلہ ضرور کرنا چاہیئے۔ عجیب بات یہاں یہ ہے کہ متحدہ جمہوری محاذ کے لیڈر جو پہلے انتخابات کو ہی حکومت بدلنے کا آئینی طریقہ قرار دیا کرتے تھے اب اچانک ایسے انتخابات میں حصہ لینے کے مخالف بن گئے تھے جو بھٹو حکومت کی نگرانی میں کرائے جائیں۔ پہلے اصغر خاں کا مطالبہ ہوا کرتا تھا کہ بھٹو حکومت مستعفی ہو جائے تاکہ فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے صحیح معنوں میں نمائندہ اور آئینی حکومت قائم کی جا سکے۔ اب یہی مطالبہ متحدہ جمہوری محاذ کا تھا اور اصغر خاں اپنا موقف بدل کر بھٹو حکومت کی زیر نگرانی ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ اصغر خاں نے اپنا موقف کیوں تبدیل کیا یہ ایک الگ بحث ہے اور اس سوال کا جواب میں آگے چل کر دوں گا۔ یہاں میں صرف بھٹو کی "ذہانت" کا جائزہ لینا چاہتا ہوں جو پہلی بار ایک حقیقی اور طاقتور چیلنج کا سامنا کر رہی تھی۔ یہ چیلنج پاکستان قومی اتحاد کے قطعی "غیر متوقع" قیام کی بدولت ابھرا تھا۔ بھٹو نے صرف ایسے انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کیا تھا جنہیں جیتنے کا اب اسے سو فیصد یقین تھا۔ اب سے اچانک ایسے انتخابات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جس میں اپوزیشن کی تمام جماعتیں ایک جھنڈے تلے متحد ہو کر حصہ لینے والی تھیں۔ غالباً اسی چیلنج کے احساس نے بھٹو کو "بڑے پیمانے پر دھاندلی" کے راستے پر ڈال دیا۔ جب پنجاب اور سندھ میں پاکستان قومی اتحاد کے لیڈروں کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی اور اصغر خاں کا استقبال کرنے کے لئے کراچی کے شہریوں نے قومی تاریخ کا سب سے بڑا جلوس نکالا

تو بھٹو کو اقتدار کی مسند پر فائز رہنے کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہ آئی کہ دھاندلی کے پروگرام پر بہت بڑے پیمانے پر عمل کیا جاتے۔ دھاندلی کا پروگرام تو پہلے ہی بن چکا تھا، لیکن بھٹو کا خیال تھا کہ زیادہ دھاندلی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اب پاکستان قومی اتحاد کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر انتخابات جیتنے کے لیئے زیادہ "مؤثر" اور "مکمل" انتظامات کی ضرورت تھی۔ اگر بھٹو میں تدبر ذہانت اور دانشمندی ہوتی تو وہ بیس پچیس نشستوں کی اکثریت حاصل کرنے پر اکتفا کرتا۔ اس صورت میں بھٹو حکومت پر دھاندلی کا الزام ثابت کرنا اور عوام کو احتجاجی تحریک پر آمادہ کرنا پاکستان قومی اتحاد کے لئے خاصا مشکل کام ہوتا لیکن عوام پر بھرپور غیر محدود اور وحشیانہ طاقت کے ساتھ حکومت کرنے کی مجنونانہ خواہش نے بھٹو کو ایک ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کیا جو اس کے زوال کا باعث بنا۔ فیصلہ یہ تھا کہ اکثریتی صوبے پنجاب میں دھاندلی اتنے بڑے پیمانے پر کی جائے کہ اپوزیشن کا وجود باقی نہ رہے۔ ذہانت، فراست، تدبر اور دانشمندی رکھنے والا کوئی بھی سیاست دان اس قسم کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا، لیکن بھٹو کو اپنی مکاری، چالاکی اور ریاکاری پر اندھا اعتماد تھا۔

اسی مکاری چالاکی اور ریاکاری سے کام لیتے ہوئے بھٹو نے چند اقدامات ایسے کیئے جن کا مقصد یہ تاثر قائم کرانا تھا کہ انتخابات واقعی آزادانہ اور منصفانہ ہوں گے مثلاً یہ کہ اخبارات پر جو سخت پابندیاں تھیں انہیں ذرا نرم کر دیا گیا پاکستان قومی اتحاد کی انتخابی مہم کے راستے میں "سرکاری طاقت" کی دیوار کھڑی کرنے سے پرہیز کیا گیا۔ خود بھٹو نے بڑے پیمانے پر پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم میں حصہ لیا تاکہ بوقت ضرورت یہ دلیل پیش کی جا سکے کہ اگر "مجھے دھاندلی کرنا ہوتی تو رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیئے اتنی بھاگ دوڑ کیوں کرتا۔" پاکستان قومی اتحاد

کو ایک ہی انتخابی نشان یعنی "ہل" الاٹ کرنے کے معاملے میں بھی بھٹو نے بڑی فراخدلی سے کام لیا۔ مقصد دنیا بھر کو یہ بتانا تھا کہ "میں اپوزیشن کے ساتھ تکنیکی بنیادوں پہ کوئی ناانصافی نہیں کرنا چاہتا"۔

پاکستان قومی اتحاد کے لیڈر بھی رائے عامہ کو یہی تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ بھٹو چاہے بھی تو دھاندلی نہیں کرا سکتا۔ خاص طور پر اصغر خاں بار بار عوام سے کہہ رہے تھے کہ "آپ انتخابات میں بھرپور حصہ لیں، کیوں کہ بھٹو کو دھاندلی کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی"۔ اصغر خاں کی اس حکمت عملی کا مقصد یہ تھا کہ عوام یہ سوچ کر بددلی کا شکار نہ ہو جائیں کہ بھٹو دھاندلی کرے گا اور دھاندلی کے ذریعے بہرحال جیت جائے گا۔ عوام کے جوش و خروش کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ انہیں بھٹو کی ناکامی اور اپنی کامیابی کے معقول امکانات نظر آتے رہیں۔ پوری انتخابی مہم کے دوران پاکستان قومی اتحاد نے ان امکانات کو روشن رکھا مگر جب انتخابات کا مرحلہ سر پہ آ پہنچا تو اصغر خاں نے قوم کو بھٹو کے منصوبے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں عوام کو بتا دیا کہ نہ صرف یہ کہ پولنگ میں زبردست پیمانے پر گڑبڑ کرائی جائے گی۔ بلکہ ووٹوں کی گنتی سے پہلے ہی ریڈیو ٹیلی ویژن اور سرکاری پریس کے ذریعے پیپلز پارٹی کی "شاندار" کامیابی کا اعلان کرانے کا اہتمام بھی کیا جا چکا ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے عوام کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کا یہی موقع سب سے مناسب تھا۔ انتخابی مہم کے دوران عوامی جوش و خروش کافی شدت اختیار کر چکا تھا۔ اور عوام اب کسی قیمت پر کوئی ایسا فیصلہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے جو ان کی امنگوں کے خلاف ہو۔

۷ مارچ ۱۹۷۷ء کی رات کو جب پیپلز پارٹی کے امیدوار ریڈیو اور

ٹیلی ویژن پر "بھاری اکثریت" کے ساتھ جیت رہے تھے اور بھٹو اپنی چشمِ تصور سے آنے والے دورِ اقتدار کی رنگینیوں کو دیکھ رہا تھا تو پاکستان کے عوام بددلی اور مایوسی کا شکار ہونے کی بجائے اپنی غیور رگوں میں دوڑنے والے گرم لہو کی قسم کھا کر عہد کر رہے تھے کہ جمہوری روایات کے قاتل کو جشنِ فتح منانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو پاکستان قومی اتحاد نے صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جو دو دن بعد ہونے والے تھے۔

۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو ملک کے تقریباً ہر پولنگ سٹیشن پر ویرانی چھائی ہوئی تھی عوام کی بھاری اکثریت نے بائیکاٹ کے فیصلے پر عمل کر کے دنیا بھر کو بتا دیا کہ وہ اس فتح کو کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے جو بھٹو نے دھوکے دھاندلی اور فراڈ کے ذریعے حاصل کی تھی۔

۱۳ مارچ ۱۹۷۷ء کو ملک گیر پیمانے پر تحریکِ جمہوریت شروع ہو گئی۔

اگر بھٹو میں ذہانت، فراست، تدبر اور دانش مندی ہوتی تو وہ ہوا کا رُخ ۸ مارچ یا ۱۰ مارچ کو ہی پہچان لیتا اور انتخابات از سرِ نو کرانے کے عوامی مطالبے کو تحریک کی شکل اختیار کرنے سے روکنے کے لئے خود ہی اعلان کر دیتا کہ "مجھے عوام کی حمایت حاصل ہے اس لئے میں دوبارہ انتخابات کرانے کے لئے تیار ہوں۔ میں خود ایسی فتح پر خوش ہونا نہیں چاہتا جس کے بارے میں ذرا سا بھی شک و شبہ ہو۔"

لیکن مکار چالاک اور ریاکار بھٹو نے عوام کی اسی طاقت سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا۔ جس نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اس کی ہوسِ اقتدار کی تکمیل کے لئے سازگار حالات پیدا کئے تھے۔ بھٹو کو یقین تھا کہ وہ مکاری چالاکی اور ریاکاری سے

کام لے کر پاکستان قومی اتحاد میں دراڑیں ڈال دے گا اور اس سے پہلے کہ عوامی تحریک پوری طرح ابھر سکے اس کی کمر توڑ دی جائے گی۔

تاریخ کا گہرا شعور رکھنے کا دعویٰ کرنے والے بھٹو نے طاقت کے نشے میں خود ہی اپنے زوال کو آواز دے دی تھی۔ سیاسی حکمتِ عملی تیار کرنے میں سب سے زیادہ مہارت رکھنے کا داعی خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر کھود چکا تھا۔

---

## آغازِ سفر

بھٹو جیسے لوگ اپنی منزلوں کا تعین بہت پہلے کر لیا کرتے ہیں اور پھر ان کا ہر قدم ان ہی منزلوں کی طرف اٹھتا ہے۔ بھٹو نے اپنی منزل کا تعین ۱۹۵۹ء میں ہی کر لیا تھا۔

بھٹو کے زوال کا تفصیلی تجزیہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے عروج کا بھی سرسری جائزہ لے لیا جائے۔

یہ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ میں سندھ یونیورسٹی میں طالب علم تھا۔ ہر نوجوان کی طرح میں بھی اپنے ملک کے مستقبل کے بارے میں بڑے حسین خواب دیکھا کرتا تھا، لیکن قومی سیاست پر جو لوگ چھائے ہوئے تھے ان کی طالع آزمائیوں، مفاد پرستیوں، خودغرضیوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں نے میرے حسین خوابوں پر مایوسیوں اور نا امیدیوں کا تاریک سایہ ڈال رکھا تھا۔ بابائے قوم قائداعظمؒ کی وفات کے بعد وطنِ عزیز نوابزادوں، جاگیرداروں، وڈیروں اور ان کے ایجنٹوں کی باہمی جنگِ اقتدار کا اکھاڑہ بن چکا تھا۔ لیاقت علی خاں نے ملک کو جمہوری آئین سے محروم رکھ کر سیاسی جوڑ توڑ اور محلاتی سازشوں کے ذریعے اقتدار کی کرسی تک پہنچنے والوں کے ہاتھ اتنے مضبوط کر دیئے تھے کہ جمہوری روایات کو یہاں قدم جمانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اگر لیاقت علی خاں نے پاکستان کو آئین دے کر قائداعظمؒ کے جمہوری خوابوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی ہوتی تو وہ اس گولی کا نشانہ نہ بنتے جس نے وطنِ عزیز کو اقتدار برائے اقتدار کی اندھی ہوس رکھنے والے قسمت آزماؤں کی شکارگاہ بنا کر رکھ دیا۔ ان قسمت آزماؤں میں غلام محمد

کا نام سرِ فہرست ہے۔ جس نے سیاسی جوڑ توڑ اور محلاتی سازشوں میں کچھ ایسا کمال حاصل کیا کہ حقیقی سیاسی اقتدار گورنر جنرل کے غیر سیاسی عہدے کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور وزیر اعظم کا عہدہ ایک فٹ بال بن کر رہ گیا۔ جب اپنے آخری ایام میں غلام محمد جسمانی اور ذہنی طور پر بالکل مفلوج ہو چکا تھا تب بھی وزیر اعظم کی حیثیت فٹ بال سے مختلف نہیں تھی۔ غلام محمد کی موت کے بعد سکندر مرزا نے اپنے پیشرو کی روایات کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھا بلکہ انہیں مزید تقویت دی۔ وہ مسلم لیگ جس نے تحریک پاکستان کو کامیابی کی منزل پر پہنچایا تھا، اب جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی گروہی سیاست کا اکھاڑہ بن چکی تھی۔ چودھری محمد علی اور سردار عبدالرب نشتر جیسے محب وطن رہنماؤں کی حیثیت نقار خانے میں طوطی کی آواز سے مختلف نہ تھی سیاسی انتشار کو اور زیادہ مستحکم کرنے کے لئے سکندر مرزا نے مفاد پرستوں کے ایک ٹولے کو ری پبلکن پارٹی کے پلیٹ فارم پر جمع کیا اور اسے ملکی سیاست میں کلیدی حیثیت عطا کر دی۔

۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان عرصہ میں قومی کردار کی تشکیل کا عمل ایکدم رک گیا تھا اور ایک ایسے معاشرے نے جنم لیا تھا جس کی کوئی نظریاتی بنیاد نہیں تھی اور جس کی رگوں اور نسوں میں خود غرضی، مفاد پرستی، اخلاقی بے حسی اور حرص و لالچ کا زہر رچ بس گیا تھا۔ مایوسی اور نا امیدی کی اس طویل رات کے اندھیروں میں حرمتِ قوم اور عظمتِ وطن کے خواب گم ہو کر رہ گئے تھے۔

پھر ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کا سورج طلوع ہوا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ میں ہاسٹل کی بجائے کرائے کے ایک مکان میں اپنے ایک دوست روشن ضمیر رضوی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ مکان کے دروازے پر میں نے یہ عبارت چسپاں کر رکھی تھی "چور یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ کریں کیوں کہ انہیں کتابوں کے سوا

کچھ نہیں ملے گا۔ سول سروس کے امیدواروں، پیشہ ور سیاستدانوں اور شکاری کتوں کو بھی یہاں سے دور رہنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔"

یہ عبارت اس نفرت کی بھرپور عکاس تھی جو میرے دل میں وطنِ عزیز کی حرمت سے کھیلنے والوں کے لئے تھی۔

اس روز میں حسبِ معمول صبح سویرے ناشتہ کرنے کے لئے گھر سے نکلا تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تاریخ کا دھارا میرے وطن کو ایک نئی سمت میں بہا لے جا چکا ہے۔ میں ریستوران کی طرف جا رہا تھا کہ میرے کانوں سے ہاکر کی آواز ٹکرائی۔

"مارشل لاء لگ گیا۔ حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ مارشل لاء لگ گیا۔"

پہلے تو میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ پھر اچانک ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہی آواز پھر میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور میں نے لپک کر ہاکر سے اخبار خریدا۔

بہت بڑی بڑی۔ جلی جلی سرخیاں تھیں۔ چیختی ہوئی، گونجتی ہوئی سرخیاں جو اعلان کر رہی تھیں کہ مایوسی اور ناامیدی کی رات بیت چکی ہے۔ امید اور تعمیرِ نو کا سویرا جنم لے چکا ہے۔ خود غرض، بے حس، مفاد پرست اور ابن الوقت سیاست دان حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے گئے ہیں۔ ملک و ملت کی کشتی کو نئے ناخداؤں نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے پاکستان کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں نے تھام لی ہے جو وطنِ عزیز کی فضاؤں میں اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم کی روشن قندیلیں بلند کریں گے۔

خوشی اور مسرت کی جو تیز لہر میری روح کی گہرائیوں سے اٹھی اسے میں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میں دیوانہ وار بھاگا اور اپنے ایک ایک دوست

کو یہ خوشخبری سنائی۔ روشن ضمیر خوشی سے اچھل پڑا، محمد طارق خان نے بھی نعرۂ مسرت بلند کیا۔ ہم سب کو، پوری قوم کو جس مسیحا کا انتظار تھا وہ آگیا تھا۔ ہم نے جشن منایا، پوری قوم نے جشن منایا۔ ملک کو سیاستدانوں کی ریشہ دوانیوں سے نجات حاصل ہوگئی تھی۔ انقلاب کا سورج طلوع ہو چکا تھا اور اس کی روشن کرنوں سے پاکستان کا مستقبل جگمگاتا نظر آرہا تھا۔

ہر نئی تبدیلی سے نئی امیدیں وابستہ کر لینا انسانی فطرت ہے۔

اور وہ لوگ جو خواب دیکھتے ہیں ان کے لئے ہر نئی تبدیلی ان کے خوابوں کی حسین تعبیریں کر ابھرتی ہے۔ بالکل ویسی ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسی شادی کے فوراً بعد ہنی مون کے دوران ہوا کرتی ہے۔ جب تک ہنی مون چلتا رہتا ہے ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد پھول غائب ہو جاتے ہیں اور ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بکھرے نظر آتے ہیں۔

ایوب خاں کا ظہور ہماری تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا ایک ایسا دور جس میں ملک کو سیاسی استحکام تو ملا لیکن عوام کی حاکمیت کے اصول کو مکمل طور پر مسترد کر دیا گیا۔ بنیادی جمہوریتوں کے جس نظام کی داغ بیل ڈالی گئی اس کے کچھ مقاصد تو یقیناً بہت اچھے تھے لیکن بنیادی مقصد یہ تھا کہ صدر اور اسمبلیوں کا انتخاب براہ راست عوام نہ کریں اور یہ حق بنیادی جمہوریتوں کے ان اسی ہزار ارکان کو ہی حاصل ہو جنہیں ترغیب اور لالچ کے ذریعے یا ڈرا دھمکا کر حاکمِ وقت کی حمایت پر مجبور کرنا نسبتاً بہت آسان تھا۔ یہ درست ہے کہ ان اسی ہزار ارکان کا انتخاب عوام ہی کرتے تھے مگر انہیں اقتدار کی کرسی کو سلام کر کے خوشحالی دولت اور حیثیت حاصل کرنے سے روکنا عوام کے بس کی بات نہ تھی۔ ۱۹۵۸ء سے پہلے طالع آزمائی اور مفاد پرستوں کا ٹولہ چند سو پیشہ ور سیاست دانوں پر مشتمل تھا۔ ایوب خاں کے دور

میں اس ٹولے کی تعداد اسی ہزار تک جا پہنچی اور ذاتی اغراض کے لئے ملکی وسائل کا استحصال کرنے اور قومی مفادات سے کھیلنے کی وبا گلی گلی گاؤں گاؤں پھیل گئی۔

ایوب خاں میں آمرانہ حکومت کرنے کی خواہش بڑی شدید تھی اگر وہ صرف اسی خواہش کی تکمیل پر اکتفا کرتے۔ اپنی لامحدود طاقت کو ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے استعمال کرتے، معاشرے کو سمگلنگ، چور بازاری، رشوت ستانی، حرص زر اور ناجائز منافع خوری جیسی لعنتوں سے پاک کرنے کے لئے تمام بدعنوان عناصر کا قلع قمع کرتے تو عوام کی بہت بڑی اکثریت کو اپنے بنیادی حقوق کے سلب ہونے کا کوئی رنج نہ ہوتا شخصی آزادی ہر باشعور شخص کو بہت عزیز ہوتی ہے کیونکہ شخصی آزادی کا تعلق انسان کی عزتِ نفس سے ہے۔ عوام کی اکثریت ملک کے وسیع تر مفادات کے لیے شخصی آزادی پر حکومت کے پہرے رضاکارانہ طور پر قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتی اگر عوام میں یہ احساس پیدا کر دیا جاتا کہ ان کی اس قربانی کی بدولت بدعنوان عناصر پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا ہے، لیکن ہوا یہ کہ عوام سے ان کی شخصی آزادی چھن گئی اور بدعنوان عناصر کو حکومت کی حمایت کرنے کے صلے میں اپنی بدعنوانیاں جاری رکھنے کی مکمل آزادی دے دی گئی۔

ایوب خاں محب وطن تھے۔ لیکن ان کی آمریت سے جس خود غرض اور مفاد پرست طبقے کو زک پہنچنا چاہیئے تھی اسی طبقے کو انہوں نے اپنا آلۂ کار بنا لیا۔ اس المیے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایوب خاں صرف آمرانہ حکومت کرنے کی شدید خواہش ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ یہ بھی چاہتے تھے کہ انہیں آمر کی حیثیت سے یاد نہ کیا جائے۔ چنانچہ جمہوریت کا لبادہ اوڑھنے کے لئے انہوں نے بنیادی جمہوریتوں کا نظام تخلیق کیا۔ اس نظام کو چلانے کے لئے چودھری خلیق الزمان کے ذریعے مسلم لیگ کا ایک جعلی کنونشن بلوا کر اس پر قبضہ کر لیا۔

جب کسی آمر کو سیاست دان بننے کا شوق ہوتا ہے تو وہ "سیاسی طبقوں" کی حمایت حاصل کرنے کے لیئے جوڑ توڑ کرتا ہے، ان کے ساتھ سمجھوتے کرتا ہے، انہیں مراعات دیتا ہے، انہیں اپنا آلہ کار بناتا ہے اور خود ان کا آلہ کار بنتا ہے۔ ضمیر خریدے جاتے ہیں۔ ضمیر بیچے جاتے ہیں اور جو ضمیر بکنے کے لیئے تیار نہیں ہوتے انہیں ظلم و جبر کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔
یہی وہ فضا تھی جس نے ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی عزائم کو جنم دیا۔

⊙ ⊙

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے تحت جو کابینہ قائم ہوئی اس کے بیشتر ارکان کے نام قوم کے لیئے بالکل نئے تھے۔ اِن نئے ناموں میں اُس نوجوان کا نام بھی تھا جو اس وقت تو کابینہ کے "شو بوائے" سے زیادہ حیثیت کا حامل نظر نہیں آتا، لیکن جس کے ساتھ آنے والے برسوں میں پاکستان کی تقدیر وابستہ ہونے والی تھی۔ اس نوجوان کے پاس قانون کی ڈگری تھی اور اس نے اعلیٰ تعلیم ہارورڈ (امریکہ) سے حاصل کی تھی۔ بظاہر اس نوجوان کو کوئی سیاسی تجربہ نہیں تھا مگر کم عمری میں ہی اس نے سیاست کے بارے کافی وسیع مطالعہ کر لیا تھا۔ قدرت کی طرف سے اسے غیر معمولی دماغ ملا تھا اور اس دماغ کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے دوسروں کی توجہ کا مرکز بننے کا آرٹ اسے خوب آتا تھا۔ سکندر مرزا کی توجہ کا مرکز وہ اس وقت بنا جب مرحوم صدر شکار اور سیر تفریح کے لیئے لاڑکانہ جایا کرتا تھا۔ لاڑکانہ میں شاہنواز بھٹو کی بہت بڑی شکار گاہ تھی۔ اسی شکار گاہ کی بدولت بھٹو خاندان کو سکندر مرزا کی میزبانی کا موقع ملا۔ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے وقت ذوالفقار علی بھٹو نے یہ ضرور سوچا ہو گا کہ ایک بڑے وڈیرے کے گھر میں جنم لینا

بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ افقِ سیاست پر طلوع ہونے کے لیے یہی خوش قسمتی کافی تھی اور بھٹو کے پاس تو پرکشش شخصیت بھی تھی، دوسروں کو متاثر کرنے والا دماغ بھی تھا۔ ایسا دماغ جس میں چالاکی، مکاری اور ریاکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔

اسی چالاکی مکاری اور ریاکاری کی بدولت وزیر بننے کے فوراً بعد بھٹو نے اندازہ لگالیا کہ سکندر مرزا کا منظورِ نظر بنے رہنے کی بجائے اسے ایوب کا منظورِ نظر بننا چاہیئے جن کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار تھا۔ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے بعد بیس دن کے اندر سکندر مرزا کا آفتابِ اقبال غروب ہوگیا۔ ان بیس دنوں میں ایوب خاں پاکستان کا مردِ آہن اور ذوالفقار علی بھٹو ایوب خاں کا منظورِ نظر بن چکا تھا۔

اقتدار کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچنے کا خواب بھٹو نے اسی زمانے میں دیکھنا شروع کردیا تھا۔ ایوب خاں کے ظہور نے پرانے سیاست دانوں کو داستانِ ماضی بنا کر رکھ دیا تھا۔ اب جو دور شروع ہوا تھا۔ اس میں صرف نئی سیاسی شخصیتوں کے ابھرنے کی گنجائش تھی۔ بھٹو کو کابینہ میں دوسرا کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا تھا جو وزارت سے آگے جانے کے عزائم رکھتا ہو۔ اور بھٹو کی نگاہیں ایوب خان کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی خلا پر جم چکی تھیں۔ تصور ہی تصور میں وہ اپنے آپ کو مستقبل کے اس سیاسی خلا کو پُر کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اپنے وسیع سیاسی مطالعے کی بنیاد پر بھٹو کو احساس تھا کہ آمریت خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو معاشرے کے باشعور طبقوں میں اس کے خلاف جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ جذبات شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ انہیں ابھار کر مزاحمت اور تحریک کی شکل دینا مشکل نہیں رہتا۔

میرے اس تجزیئے کو بعض حضرات شاید بعید از قیاس قرار دیں مگر میں تاریخ کے طالبعلم کی حیثیت سے پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بھٹو جیسے لوگ

اپنی منزلوں کا تعین بہت پہلے کر لیا کرتے ہیں اور پھر ان کا ہر قدم ان ہی منزلوں کی طرف اٹھتا ہے۔ جس کرسی پر ایوب خاں نے قبضہ کیا تھا وہ کرسی بھٹو کو اپنی پہنچ سے باہر نظر نہیں آ رہی تھی۔ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ مکمل اور جامع حکمت عملی تیار کی جائے اور جب مناسب وقت آئے تو مناسب قدم اٹھایا جائے۔

بھٹو نے جو حکمت عملی تیار کی اس کا پہلا مرحلہ کچھ اس طرح تھا۔

۱۔ ایوب خاں کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کیا جائے۔

۲۔ زیادہ سیاسی اہمیت حاصل کرنے کے لئے اپنے ارد گرد وفادار ساتھی جمع کئے جائیں۔

۳۔ قومی سطح پر ابھرنے سے پہلے بین الاقوامی سطح پر اپنا امیج بنایا جائے۔

۴۔ فوج اور بیوروکریسی میں اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے افسروں کے ساتھ نجی سطح پر تعلقات استوار کئے جائیں۔

ایوب خان کا مکمل اعتماد حاصل کرنا بھٹو کے لئے مشکل بات نہ تھی۔ ایوب خاں جو ہر قابل کو خاصی اہمیت دیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے پہلے قدرت اللہ شہاب اور پھر الطاف گوہر جیسے لوگوں کو ایوب خان کی پالیسیوں میں خاصا عمل دخل رہا۔ بھٹو ان سب حضرات سے زیادہ دماغی صلاحیتیں رکھنے کی وجہ سے ایوب خاں کے سب سے زیادہ قریب ہوتا چلا گیا۔ اس نے کچھ لوگ ایسے بھی تیار کئے جو ایوب خاں کی نظروں میں بھٹو کی قدر و منزلت بڑھانے کا کام کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بظاہر بھٹو کے خلاف تھے، لیکن درپردہ اس کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے۔ جب ایوب خاں نے مسلم لیگ پر قبضہ کیا تو بھٹو جوڑ توڑ کے ذریعے اپنی سیاسی قوت بڑھانے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران بھٹو کو کچھ طاقتور

مخالفین کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں نام نواب آف کالاباغ کا تھا، لیکن مسلم لیگ (کنونشن) کا سیکرٹری جنرل بننے کے بعد بھٹو کی پوزیشن خاصی مضبوط ہو چکی تھی اور اس نے اپنے حامیوں کا ایک طاقتور دھڑا بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔

اپنا بین الاقوامی امیج بنانے کے لئے بھی بھٹو نے متعدد اقدامات کئے۔ قدرتی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے اس کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس کی نظریں وزارتِ خارجہ پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر ایوب خاں ایک نوعمر شخص کو ایسی ذمہ داریاں سونپنے کے لئے تیار نہیں تھے جن کے لئے وسیع تجربے اور پختگی کی ضرورت تھی۔ قدرتی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے بھٹو نے سوویت یونین کا جو دورہ کیا اسے اس نے اپنے امیج کی پروجیکشن کے لئے استعمال کرنا چاہا مگر بات نہ بنی۔ چنانچہ جب چین اور پاکستان کے درمیان سرحدی معاملات پر مذاکرات کا فیصلہ ہوا تو بھٹو نے چکر چلا کر ایوب خان کو آمادہ کر لیا کہ اسے ان مذاکرات میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔ اس کے علاوہ جب مسئلہ کشمیر پر بھارت کے ساتھ گفت و شنید کی صورت پیدا ہوئی تو بھی بھٹو نے پاکستانی وفد کی قیادت کرنے کا موقع حاصل کر لیا۔

ان دونوں باتوں کو بھٹو نے اپنا امیج بنانے کے لئے بڑے ہی بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ ایک تو اس کے لئے یہ پروپیگنڈا کرنے کی راہ ہموار ہو گئی کہ وہی پاک چین دوستی کا خالق اور معمار ہے (حالانکہ سرحدی سمجھوتہ قطعی طور پر ایوب خان کی ہدایت کے مطابق ہوا تھا)۔ اس کے علاوہ بھٹو نے اپنا نام مسئلہ کشمیر کے ساتھ وابستہ کر کے عوام کے جذبات تک رسائی حاصل کرنے کا موزوں ترین راستہ دریافت کر لیا۔

اب ایوب خان کو یہ یقین دلانا مشکل نہ تھا کہ "خارجہ امور میں جس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھٹو میں بدرجہ اتم موجود ہیں" ۱۹۶۳ء کے اوائل میں اس وقت کے وزیر خارجہ محمد علی بوگرا کا انتقال ہو گیا اور ایوب خان نے وزارت خارجہ کا قلمدان بھٹو کے حوالے کر دیا۔ اپنا بین الاقوامی امیج بنانے کے لئے بھٹو کو جس پوزیشن کی ضرورت تھی وہ اسے حاصل ہو چکی تھی۔

فوج اور بیوروکریسی میں تعلقات پیدا کرنے کی اہمیت کو بھی بھٹو نے نظر انداز نہیں کیا تھا اور کئی ایسے افسر اس کے حلقۂ احباب میں شامل ہو چکے تھے جنہیں شراب و کباب کی محفلوں سے رغبت تھی۔ کچھ افسر ایسے بھی تھے جنہیں بھٹو اپنی ذہنی صلاحیتوں سے مرعوب کر چکا تھا اور جو اس سے روابط رکھنا اپنے لئے سود مند سمجھتے تھے۔

ان تمام کامیابیوں کے باوجود اس دور میں بھٹو کا عوامی امیج ایسا نہیں تھا۔ جس پر کوئی بھی باعزت خود دار اور شریف آدمی فخر کر سکے۔ شراب و شباب کی جو محفلیں بھٹو سجایا کرتا تھا یا اس کی ایما پر سجائی جاتی تھیں ان کے قصے کثرت کے ساتھ باخبر لوگوں کی زبان پر رہا کرتے تھے۔ شراب و شباب کے رسیا اس عیاش وڈیرے کی حرکتوں کو دیکھ کر کوئی آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے پاکستان میں ایک دن یہ شخص عوام کی انقلابی امنگوں کا نقیب بن جائے گا۔ خود مجھے اس بات پر شرم محسوس ہوتی تھی کہ بھٹو جیسے کردار کے لوگ ہماری ملکی سیاست میں جڑیں پکڑ رہے ہیں۔

میں نے بھٹو کو پہلی مرتبہ کراچی کے اس جلسۂ عام میں دیکھا جسے نوزائیدہ کنونشن لیگ نے منعقد کیا تھا۔ اس جلسے کی صدارت ایوب خان کر رہے تھے ان کے پہلو میں خلیق الزمان تھے۔ میں اس زمانے میں روزنامہ کوہستان کے کراچی آفس

کا انچارج تھا اور اگرچہ میری ذمہ داریاں انتظامی نوعیت کی تھیں اور صحافت سے میرا کوئی براہ راست تعلق نہیں تھا، پھر بھی اپنے وطن کے حاکموں کو قریب سے دیکھنے کی خواہش مجھے اس جلسہ عام میں لے گئی تھی۔ وہاں میں نے ایک خوش پوش شخص کو دیکھا جو سٹیج سے کچھ دور کھڑا سیاسی کارکنوں کو ہدایات جاری کر رہا تھا۔ اس شخص کی خوش پوشی کا یہ عالم تھا کہ اس نے خاصی تکلیف دہ گرمی میں بھی مکمل سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ بڑے سٹائلش انداز میں جما ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنے ملک کا ایک وزیر کم اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصہ کے دوران ہالی وڈ میں بننے والی فلموں کا ہیرو زیادہ لگا۔ اس کی چال میں بڑی تیزی تھی۔ اس کی حرکات میں بڑا اعتماد تھا۔ میں دیر تک اس کا جائزہ لیتا رہا۔ بظاہر وہ محض ایک سمارٹ اور خوش پوش "ٹیڈی" لگ رہا تھا، لیکن اس کی شخصیت میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جو میری توجہ کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ یہ بات مجھے نظر نہیں آ رہی تھی مگر میں اسے محسوس کر رہا تھا۔ شاید اسی خاصیت کو CHARISMA کہتے ہیں۔ شخصیت کا وہ سحر جس نے بھٹو کے عروج میں بنیادی کردار ادا کیا۔

بھٹو کو دوسری مرتبہ میں نے چند ہی ماہ بعد دیکھا۔ مسئلہ کشمیر پر بھٹو اور سردار سورن سنگھ کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ چل رہا تھا۔ غالباً وہ مذاکرات کا تیسرا دور تھا۔ جب سردار سورن سنگھ کراچی آیا۔ کراچی کے ہوائی اڈے پر بھٹو نے اسے خوش آمدید کہا۔ اخبار نویس بھی وہاں موجود تھے۔ رمضان کا مہینہ اور سہ پہر کا وقت تھا۔ جیسے ہی سورن سنگھ جہاز سے اترا تو بھٹو نے گرم جوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا۔ اس کے بعد ٹرے میں دونوں لیڈروں کو ٹھنڈا مشروب پیش کیا گیا۔ بھٹو نے باتیں کرتے ہوئے لاپرواہی سے اپنا گلاس اٹھالیا۔ مگر سردار سورن سنگھ نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ "یہ رمضان کا مہینہ ہے"۔

ایک لمحے کے لئے بھٹو کا چہرہ اتر گیا مگر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے وہ مسکرایا اور بولا۔" خوشی کی بات ہے کہ آپ نے روزہ رکھا ہوا ہے۔"

اس وقت میں نے سوچا کہ اتنی بڑی چوٹ سہہ کر اس کا مناسب جواب دینا یقیناً ایک چالاک اور زیرک شخص کا ہی کام تھا۔

اسی رات کی بات ہے۔ سردار سورن سنگھ کے ہاتھوں بھٹو کو ایک اور چوٹ سہنی پڑی۔ مذاکرات اور استقبالیہ کے لئے سٹیٹ بنک کی عمارت کی چھت منتخب کی گئی تھی۔ چھت پر بڑی خوب صورت ٹرف بچھی ہوئی تھی اور اچھے خاصے باغیچے کا گمان ہوتا تھا۔ سردار سورن سنگھ نے مسکراتے ہوئے بھٹو سے کہا۔" آپ کو کشمیر کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے تو اتنی ترقی کر لی ہے کہ عمارتوں کی چھتوں پر کشمیر کا سماں پیدا کر دیا ہے۔"

بھٹو نے فوراً ہی اس چوٹ کا جواب دیا۔" کشمیر کی ضرورت ہمیں نہیں کشمیریوں کو ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کشمیر کشمیریوں کو مل جائے تاکہ وہاں بھی ایسی ہی ترقی ہو سکے۔"

ان باتوں کا ذکر میں نے بھٹو کی ان صلاحیتوں پر زور دینے کے لئے کیا ہے جن کی بدولت اسے حیرت انگیز عروج حاصل ہوا اور جن سے انکار اس کے بدترین مخالف اور دشمن بھی نہیں کریں گے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر بھٹو کو قدرت کی طرف سے دماغ کے ساتھ ضمیر بھی ملتا تو پاکستان کی تاریخ کتنی مختلف ہوتی۔ ذہانت، تدبر بصیرت اور دانش مندی کا تعلق صرف دماغ سے نہیں ہوتا، ضمیر کی روشنی سے بھی ہوتا ہے۔ یہ صرف پاکستان کی ہی نہیں خود بھٹو کی بھی بدقسمتی ہے کہ اسے قدرت نے دماغ تو غیر معمولی عطا کیا، لیکن ضمیر کی روشنی سے محروم رکھا۔ ضمیر کی روشنی اگر کسی شخص کے پاس نہ ہو تو وہ خواہ کتنے ہی غیر معمولی دماغ کا حامل کیوں نہ ہو۔ اس ذہانت، تدبر، بصیرت اور دانشمندی سے کام نہیں لے سکتا جس کا مظاہرہ

عہد آفرین اور تاریخ ساز شخصیتیں کرتی ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ کو بھی کسی نہ کسی مرحلے پر ضمیر کی روشنی سے پیدا ہونے والی اخلاقی قوت کی ضرورت ضرور پیش آتی ہے۔

اس قسم کی اخلاقی قوت کسی شخص میں موجود نہ ہو تو اس کے دماغ کی صلاحیتیں ذہانت تدبر، بصیرت اور دانشمندی کی بجائے مکاری چالاکی اور ریاکاری کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ عروج کی طرف اپنا سفر طے کرتے وقت کسی بھی مرحلے پر بھٹو نے ضمیر کی روشنی اور اخلاقی قوت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اسے ضرورت صرف مکاری چالاکی اور ریاکاری کی تھی جس کا مظاہرہ اس نے بڑی کثرت اور بڑے تسلسل کے ساتھ کیا۔

---

# منزل کی طرف

اس رات ایوب خان کو
قوم سے خطاب کرنا چاہیے
تھا۔ مگر بھٹو نے چالاکی
سے عوام کے دلوں میں گھر
کرنے کا یہ موقع خود حاصل
کرلیا۔ قومی لیڈر بننے کی
مہم میں بھٹو کی یہ پہلی
پرفارمنس تھی۔

۱۹۶۴ء کے اواخر میں جب ایوب خاں کو محترمہ فاطمہ جناح کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا تو بھٹو نے اندازہ لگا لیا کہ آمریت کے قلعے میں دراڑیں پڑ چکی ہیں اور عوام کے اندر مزاحمت کا وہ جذبہ پیدا ہو چکا ہے جسے نفرت کے سانچے میں ڈھال کر حکومت سے ٹکرانے والی طاقت کا روپ دیا جا سکے۔ گورنر مغربی پاکستان نواب آف کالاباغ کے ڈنڈے کے باوجود عوام بڑے جوش و خروش کے ساتھ قائداعظم کی بوڑھی بہن کی قیادت میں چلنے والی جمہوری تحریک میں حصہ لیتے نظر آ رہے تھے۔ جن سیاسی جماعتوں پر ایوب خاں کے آمرانہ اندازِ حکومت نے قومی معاملات میں شامل ہونے کے تمام دروازے بند کر دیئے تھے اور اقتدار کی منزل جن سیاست دانوں کی پہنچ سے بہت دور چلی گئی تھی ان سب نے اپنی امیدیں محترمہ فاطمہ جناح کی قابلِ احترام شخصیت سے وابستہ کر لی تھیں۔ یہی وہ دور تھا جس میں شیخ مجیب الرحمان نے غیر معمولی سیاسی قوت حاصل کرنی شروع کر دی۔ محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم کے دوران ہی شیخ مجیب الرحمان کا معروف چھ نکاتی فارمولا منظرِ عام پر آیا۔ اس متنازعہ فیہ فارمولے کو منظرِ عام پر لانے والا روزنامہ کوہستان تھا۔

میں اس زمانے میں روزنامہ کوہستان کا ایگزیکٹو ایڈیٹر تھا۔ چیف رپورٹر منظور ملک تھے جو آج کل ہفت روزہ لیل و نہار چلا رہے ہیں۔ لاہور میں اپوزیشن

کی جماعتوں کا کنونشن ہو رہا تھا جس میں انتخابی منشور کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس کنونشن میں شیخ مجیب الرحمان نے بھی شرکت کی۔

پہلے دن کے اجلاس کے بعد چیف رپورٹر منظور ملک بھاگے بھاگے دفتر آئے تو ان کی آنکھیں کسی بڑی کامیابی کے احساس سے چمک رہی تھیں۔ میں نے ان سے اجلاس کی کارروائی کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پڑھ لیجئے۔ میں نے بڑی صفائی سے اس دستاویز کو شیخ مجیب الرحمان کے بریف کیس سے چرایا ہے۔" منظور ملک نے جواب دیا۔

شیخ مجیب الرحمان کا نام سن کر میں نے بڑی دلچسپی سے دستاویز کو پڑھا میرے سامنے عوامی لیگ کا وہ چھ نکاتی فارمولا پڑا تھا جو آنے والے ادوار میں پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا تھا۔ اس دستاویز کی اہمیت کا اندازہ مجھے اسی وقت ہو گیا تھا مگر یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی چند سال بعد اسے پاکستان کو توڑنے والا ہتھیار بنا دیا جائے گا۔

اگلی صبح کوہستان کا پورا پہلا صفحہ شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات کے متعلق بڑی بڑی جلی سرخیوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس دستاویز کی اشاعت سے اتنا بڑا طوفان اٹھ کھڑا ہوا کہ شیخ مجیب الرحمان کو اس سے لاتعلقی ظاہر کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور محترمہ فاطمہ جناح کے انتخابی منشور میں اسے کوئی جگہ نہ مل سکی۔

اس وقت میرے نزدیک اس قسم کا فارمولا تیار کرنا نظریۂ پاکستان کے ساتھ غداری اور ملکی سالمیت کے خلاف سازش کرنے کے مترادف تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ شیخ مجیب الرحمان کو جمہوری محاذ سے اپنے نکات منوانے کا موقع نہیں مل سکا۔ ورنہ

محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم کو پروپیگنڈے کے سرکاری ذرائع زبردست نقصان پہنچاتے۔

اس وقت میں اور مجھ جیسے انتہاپسند قومی خیالات رکھنے والے لوگ مشرقی پاکستان کے مسئلے کو حقیقت پسندی کی آنکھ سے دیکھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ نظریہ پاکستان اور حب الوطنی کے جوش میں ہم یہ نہیں سوچ پا رہے تھے کہ ایوب خان کی آمریت نے مشرقی پاکستان کے عوام کو ایک خطرناک احساس محرومی میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مغربی پاکستان اقلیتی صوبہ ہونے کے باوجود سیاسی طور پر ہمیشہ اکثریتی صوبے مشرقی پاکستان پر حاوی رہے گا۔ چنانچہ کم از کم مشرقی پاکستان کے معاملات میں تو اس کے عوام اور لیڈروں کو ثانوی حیثیت حاصل نہ رہے۔

اس مسئلے کو بھٹو نے بھی یقیناً خوب جانچا اور پرکھا ہو گا۔ ہر زاویے سے اس کا جائزہ لیا ہو گا۔ حب الوطنی اور نظریہ پاکستان کی عینک لگا کر نہیں۔ ایک ایسے سیاستدان کی نظر سے جو اسلام آباد کے قصرِ صدارت کو اپنی منزل بنا چکا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ ایوب کی آمریت اگر قائم رہی تو مشرقی پاکستان میں اس کے خلاف ردِعمل شدید سے شدید تر ہوتا چلا جائے گا اور بالآخر شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ اس ردِعمل کو اپنی سیاسی قوت کی بنیاد بنا لے گی۔ بھٹو کو یہی طرح علم تھا کہ مشرقی پاکستان کے ہندو اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ اور عوامی لیگ پران کا اثر و رسوخ اتنا بڑھے گا کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان شکوک و شبہات اور باہمی عدم اعتمادی کی دیوار بلند سے بلند تر ہو جائے گی۔ بھٹو کو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے ایسی ہی فضا کی ضرورت تھی اور اس کے لئے وہ چند برس انتظار کر سکتا تھا۔ ان چند برسوں کے دوران اس کی حکمت

حملی یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح مغربی پاکستان کے عوام کو اپنے پیچھے لگاتے۔ بھٹو کو سمجھنے کے لئے اس کے الفاظ بیانات اور تقاریر کو نہیں اس کے عمل کو اہمیت دینی چاہیئے۔ جو باتیں وہ کہتا ہے وہ دوسروں پر مطلوبہ تاثر قائم کرنے کے لئے کہتا ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے وہ اپنے طے شدہ مقاصد کی تکمیل کے لئے کرتا ہے

ایوب خاں کی انتخابی مہم کے دوران بھٹو نے اپنے آقا کی خوشنودی کے لئے بعض بیانات محترمہ فاطمہ جناح اور ان کی زیر قیادت چلنے والی جمہوری تحریک کے خلاف ضرور دیئے تھے، لیکن عملی طور پر اس نے اس مہم سے دور رہنے کی پوری کوشش کی۔ ایوب خاں کے دست راست کی حیثیت سے اسے چاہیئے تھا کہ وہ ہر سٹیج پر اپنے آقا کے ساتھ نظر آتے۔ عوام کے سامنے جاتے اور ان کی صفوں میں گھس کر ایوب خاں کا کیس لڑے۔ لیکن وہ خانہ پُری کی حد تک ایوب خاں کا وفادار نظر آنا چاہتا تھا۔ جن عوام کو وہ اپنے پیچھے لگا کر اقتدار کی منزل تک پہنچنا چاہتا تھا ان عوام کے سامنے وہ ایوب خاں کے اقتدار کے تحفظ کے لئے جانے کے لئے تیار نہ تھا۔

۲ جنوری ۱۹۶۵ء کو بنیادی جمہوریتوں کے اسی ہزار ارکان نے ملک کا اگلا صدر منتخب کرنے کے لئے ووٹ ڈالے۔ اس روز میں نے روزنامہ کوہستان کے صفحۂ اول کی تیاری پر خاصی محنت کی تھی ایک طرف ایوب خان کی تصویر تھی اور دوسری طرف محترمہ فاطمہ جناح کی۔

سرخی یہ تھی۔

"آج قوم اچھائی اور برائی کے درمیان انتخاب کرے گی"۔ اچھائی کا لفظ محترمہ فاطمہ جناح کی تصویر کے اوپر اور برائی کا لفظ ایوب خاں کی تصویر کے اوپر سجایا گیا تھا۔

انتخابی نتائج کا اعلان چار بجے سہ پہر کے بعد شروع ہونا تھا۔ میں انتظار کے طویل اور صبر آزما لمحات گذارنے کے لئے میٹنی شو دیکھنے چلا گیا۔ انٹرول میں باہر نکلا تو سامنے کچھ لوگ نظر آئے۔ جنہوں نے ریڈیو کے ساتھ کان لگا رکھے تھے دھڑکتے دل کے ساتھ میں ریڈیو کے قریب گیا۔ چند ہی لمحوں میں میری امیدوں کے محل گر گر مسمار ہو چکے تھے۔ ایوب خان کو ہر انتخابی حلقے سے بھاری اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔

اس رات میں نے سوچا کہ ایک آمر کو جمہوری طریقوں سے شکست دینا کس قدر مشکل تھا۔ عوام محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ تھے اور جیت ایوب خان کی ہوئی تھی اس جیت کو یقینی بنانے کے لئے ایوب خاں کی انتظامیہ نے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کئے۔ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو کیا کیا لالچ دیئے گئے اور جو لالچ میں نہ آئے انہیں کیسی کیسی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔ یہاں میرا موضوع بھٹو ہے جو انتخابات کے اس ڈرامہ سے ایک واضح نتیجے پر پہنچ چکا تھا اور وہ یہ کہ عوام اور ایوب خان کے درمیان جو خلیج حائل ہو چکی ہے اسے پاٹنا ایک آمر کے بس کی بات نہ تھی اور وقت آگیا تھا کہ بھٹو خود عوام کو اپنے پیچھے لگانے کے لئے کوئی ترکیب سوچے۔

اتفاق سے کچھ ہی عرصہ بعد رن کچھ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک محدود جنگ چھڑ گئی۔ لندن میں ایوب خاں اور بھارتی وزیر اعظم شاستری کے درمیان مذاکرات کے نتیجے میں رن کچھ کا مسئلہ بین الاقوامی عدالت انصاف کے سپرد تو کر دیا گیا۔ لیکن بھارت اور پاکستان کے درمیان اچانک اتنی سخت کشیدگی پیدا ہو گئی تھی کہ بھٹو کو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک مؤثر ہتھیار مل گیا۔

○ ○

بھٹو اپنا عوامی امیج ایک سامراج دشمن چین نواز ایشیائی رہنما کے طور پر بنانا چاہتا تھا لیکن درپردہ اس کے روابط بدنام زمانہ امریکی تنظیم سی آئی اے کے ساتھ قائم ہو چکے تھے۔ ایوب خاں کو امریکی ڈیموکریٹک پارٹی پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھتی تھی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس پارٹی کے لبرل فلسفی امریکی امداد ایسے ممالک کو فراہم کرنے کے حق میں نہیں تھے جہاں آمرانہ نظام قائم ہوں۔ ان لبرل فلسفیوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جس ملک میں آمرانہ نظام قائم ہو وہاں کے عوام ایسی امریکی امداد کے خلاف جائز طور پر شدید غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں جو اس آمرانہ نظام کو مزید تقویت دینے پر خرچ ہوتی ہو۔ اس طرح امداد دے کر امریکہ کا امیج بہتر ہونے کی بجائے اور زیادہ بگڑ جاتا ہے۔

۱۹۶۱ء کے اوائل میں جب ڈیموکریٹک پارٹی کے کامیاب امیدوار جان ایف کینیڈی نے امریکہ کی صدارت سنبھالی تو امریکی حکومت نے ایوب خاں کو زیادہ جمہوری طور طریقے اختیار کرنے کے مشورے دینے شروع کر دیئے۔ ان مشوروں نے جب دباؤ کی صورت اختیار کی تو ایوب خاں نے ناراض ہو کر اپنی خارجہ پالیسی کو امریکی مفادات کے تنگ دائرے سے نکالنا شروع کر دیا۔ چین کے ساتھ تعلقات کو اور زیادہ مضبوط کیا گیا اور سوویت یونین کے معاملے میں بھی حکومت پاکستان کا رویہ تبدیل ہونے لگا۔ اس کے علاوہ ایوب خان نے یورپی ممالک کے ساتھ بالعموم اور عرب ممالک کے ساتھ بالخصوص زیادہ مستحکم بنیادوں پر تعلقات استوار کرنے شروع کر دیئے۔

ظاہر ہے کہ پاکستان کی اس آزاد روی کو امریکہ نے اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ چنانچہ ایوب خاں کا "مزاج" درست کرنے کے لئے امریکی حکومت نے ایک طرف تو بھارت کی طرف جھکنا شروع کر دیا اور دوسری طرف پاکستان میں متبادل قیادت پیدا کرنے کی

ذمہ داری سی آئی اے کو سونپ دی۔

یہ صورت حال بھٹو کے "عزائم" کے لئے ایک نیک فال تھی! سے سی آئی اے سے خفیہ روابط قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ بھٹو ایوب خاں کے لئے خطرہ بننے کی اہلیت ثابت کر دکھائے۔

رن کچھ کی لڑائی کی وجہ سے پاک بھارت تعلقات میں جو زبردست کشیدگی پیدا ہوئی تھی اسے بھٹو نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مسئلہ کشمیر موجود تھا اور بھٹو جیسے چالاک شخص کے لئے ایوب خان کے ذہن میں یہ بات ڈالنی مشکل نہ تھی کہ کشمیر کے ساتھ پوری قوم کے جذبات وابستہ ہیں اور اگر آزادی کشمیر کے لئے کوئی موثر قدم اٹھایا جائے تو رائے عامہ فوراً ایوب خان کو ایک قومی ہیرو کا درجہ عطا کر دے گی۔

ایوب خاں نے محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم کے دوران اپنی ساکھ کے بت کو ٹوٹتے ہوتے دیکھ لیا تھا اس لئے وہ اپنے امیج کو عوام کی نظروں میں بحال کرنے کے لئے ذہنی اور جذباتی طور پر ہر قسم کا اقدام کرنے کے لئے تیار تھے۔ آہستہ آہستہ یہ بات ان کے ذہن میں بیٹھتی چلی گئی کہ آزادی کشمیر کے مشن کی تکمیل ان پر عوام کے دلوں کے دروازے کھول دے گی اور وہ تاریخ میں ایک قومی ہیرو کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے۔ بھٹو کی چال کامیاب ہو چکی تھی۔

کشمیر کو مسلح جدوجہد کے ذریعہ آزاد کرانے کا منصوبہ برق رفتاری سے تیار کیا گیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ہنگامی بنیادوں پر ضروری اقدامات کئے گئے منصوبہ یہ تھا کہ تربیت یافتہ "گوریلے" بڑی تعداد میں مقبوضہ کشمیر بھیجے جائیں۔ جو اچانک وہاں بڑے پیمانے پر چھاپہ مار جنگ کی فضا پیدا کر دیں اور ساتھ ہی ساتھ کشمیری عوام کو اس جنگ میں شریک کرنے کی کوشش کریں۔ اس منصوبہ پر عملدرآمد

کرنے سے پہلے اگر کشمیری عوام کو ذہنی جذباتی اور عملی طور پر مسلح جدوجہد کے لئے تیار کیا جاتا تو ہمارے وہ مجاہدین جو سر پر کفن باندھ کر مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوتے تھے ان کی قربانیاں شاید رائیگاں نہ جاتیں، لیکن اس مقصد کے لئے ایک لمبا عرصہ درکار تھا اور ایوب خان اتنا بڑا مشن ہنگامی بنیادوں پر جلد از جلد مکمل کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ اگست ۱۹۶۵ء کے پہلے ہفتے میں وادی کشمیر گولیوں اور بموں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ ۹ اگست کو صدائے کشمیر کی نشریات شروع ہو گئیں اور ہر روز مجاہدین کشمیر کی پیش قدمی اور مزید کامیابیوں کے اعلانات نشر ہونے لگے۔

بھارت کا شدید ردعمل غیر متوقع نہیں تھا۔ بھارتی حکومت نے الزام لگایا کہ مقبوضہ کشمیر میں اچانک پیدا ہونے والی صورت حال کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ ہے اور جو لوگ چھاپہ مار کارروائیوں میں مصروف ہیں وہ کشمیری نہیں پاکستانی "گھس بیٹھیے" ہیں۔ جوابی کارروائی کے طور پر بھارت نے اپنی فوجیں آزاد کشمیر میں داخل کر دیں۔ کرگل اور ٹتوال وغیرہ پر قبضہ کرنے کے بعد بھارتی فوجوں نے حاجی پیر پاس کو اپنے کنٹرول میں لینے کے لئے پیش قدمی شروع کر دی کیونکہ بھارتی دعووں کے مطابق "پاکستانی مداخلت کار" اسی راستے سے مقبوضہ کشمیر میں بھیجے جا رہے تھے۔

حکومت پاکستان نے بھارت کی اس کارروائی کو ایک آزاد ملک کے خلاف کھلی جارحیت قرار دیتے ہوئے واضح کیا کہ اگر بھارتی حملہ جاری رہا تو پاکستان اس کا مؤثر جواب دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ بھارت نے اس انتباہ کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا کہ جارحیت کا آغاز پاکستان نے کیا ہے اور بھارتی فوجیں جو کارروائی کر رہی ہیں وہ محض دفاعی نوعیت کی ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا اچانک بارود کے ڈھیر پر کھڑا تھا۔
اور بھٹو کی نظریں مستقبل پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ چشمِ تصور سے ان حالات کا جائزہ لے رہا تھا جو متوقع پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تھے۔ چند باتوں کا اسے پوری طرح یقین تھا۔ ایک تو یہ کہ حاجی پیر پاس کی طرف بھارتی یلغار کے جواب میں پاکستان کو بھی موثر فوجی کارروائی کرنا پڑے گی۔ ایسی صورت میں بھارت جنگ کے دائرے کو وسیع تر کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اور پھر براہ راست دونوں ملکوں کا تصادم ہو گا۔ اس بات سے قطع نظر کہ کس ملک کا پلہ بھاری رہتا ہے۔ یہ بات یقینی تھی کہ اقوام متحدہ اور بڑی طاقتوں کی مداخلت سے جنگ بند ہو جائے گی۔ جنگ بندی کے بعد بھٹو کو ہر صورت میں اپنے لئے کئی "امکانات" نظر آ رہے تھے۔ ان "امکانات" سے بھرپور فائدہ اٹھا کر آگے بڑھنا بھٹو کے لئے مشکل بات نہ تھی۔

○ ○
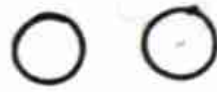
یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کی دوپہر کو ریڈیو پاکستان نے اعلان کیا کہ بھارتی جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے پاکستانی فوجیں مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئی ہیں اور دریائے توی کو عبور کر کے چھمب کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

اسی سہ پہر کو پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوجوں کی کامیاب پیش قدمی کی خبروں کے ساتھ یہ اعلان ہوا کہ "آج رات وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو قوم سے خطاب فرمائیں گے"۔

عوام کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کے پیش نظر وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم دن تھا۔ بھارتی جارحیت کے خلاف پاکستانی فوجوں کی کامیاب کارروائی نے عوام میں زبردست جوش خروش پیدا کر دیا تھا۔ دلوں میں ایمان کی چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔ قومی غیرت کا احساس پوری شدت کے ساتھ بیدار ہو گیا تھا۔ بھٹو کے لئے یہ بہترین

موقع تھا کہ عوام کے ساتھ جذباتی رشتہ قائم کر لے۔ قوم نفسیاتی طور پر ایسے لیڈر پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کے لئے تیار تھی جو ان کی قومی حمیت کا نقیب بن کر سامنے آتے۔

اس رات ایوب خان کو قوم سے خطاب کرنا چاہیئے تھا مگر بھٹو نے کسی نہ کسی طرح عوام کے دلوں میں گھر کرنے کا یہ موقع خود حاصل کر لیا۔

وہ لمحات مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہیں جب میرے کان ریڈیو پر بھٹو کی آواز سننے کے منتظر تھے۔ ایوب کابینہ کا عیاش شہزادہ اچانک میری نظروں میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔

بھٹو کی وہ پہلی تقریر تھی جو میں نے سنی۔ بڑی ہی جذباتی، بڑی ہی جوشیلی اور بڑی ہی اثر انگیز تقریر تھی۔ بھٹو نہیں بول رہا تھا۔ میں خود بول رہا تھا۔ بھٹو کی آواز نہیں تھی میری اپنی آواز تھی۔ میری آواز بھٹو کی آواز بن گئی تھی اور یہ آواز بھارتی سامراج کو للکار کر کہہ رہی تھی کہ صلاح الدین ایوبی اور محمود غزنوی کے جانشین اس عفریت کی آنکھیں نکال دیں گے جس نے وطن عزیز کی مقدس سرحدوں پر بری نظر ڈالی تھی۔

اس تقریر پر بھٹو نے یقیناً بڑی محنت کی تھی قومی جذبات کے بھرپور اظہار کے ساتھ اس تقریر میں ایسے حوالے بھی تھے جن سے مسلم تاریخ کے ساتھ بھٹو کی گہری وابستگی کا تاثر قائم ہوتا تھا۔ قومی لیڈر بننے کی مہم میں بھٹو کی یہ پہلی پرفارمنس تھی اور یہ پرفارمنس اتنی شاندار تھی کہ میں جو اس وقت تک اسے محض ایک عیاش وڈیرہ زادہ سمجھتا تھا اچانک اس کی تمام برائیوں کو بھول کر اس کا مداح بن گیا۔ میں بہت زیادہ ذہین آدمی نہیں ہوں، لیکن پھر بھی اگر میں دماغ سے کام لیتا تو بھٹو کی اس پرفارمنس کو اس کے کردار کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش ضرور کرتا۔ میں اپنے دماغ سے کام

اس لیتے نہ دے سکا کہ اس وقت سوچنے کا کام میرا دل انجام دے رہا تھا اور میرے دل میں بس ایک ہی تڑپ تھی کہ تاریخ کے اس اہم موڑ پر قدرت کسی ایسے رہنما کو جنم دے جو ہماری قومی امنگوں کا نقیب بن کر اٹھے اور بھارت کو بتادے کہ پاکستان محض چند جغرافیائی سرحدوں کا نام نہیں بلکہ اس عظیم نظریۂ حیات کا نام بھی ہے جس نے صدیوں تک دنیا کے بیشتر حصوں پر حکومت کی تھی اور جس کی عظمت اور فضیلت کے محافظ اب بھی موت کا استقبال فاتحانہ مسکراہٹوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

میں نے اپنے دل کی اس تڑپ کے آئینے میں بھٹو کو دیکھا تو میری آنکھیں دھوکہ کھا گئیں۔ میرا یہی فریب نظر بھٹو کے عروج کا باعث بنا۔ یہ صرف میرا ہی فریب نظر نہیں تھا۔ میرے ان تمام ہموطنوں کا فریب نظر بھی تھا جو اپنے ملّی جذبات اور قومی ولولوں کو کسی زندہ وجاوید شخصیت کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ بھٹو کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس نے میرے اور مجھ جیسے لاکھوں وطن پرستوں کے خوابوں میں جھانک کر دیکھ لیا تھا اور یہ بھٹو کی بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ ایوب خاں کو اس کے عزائم کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔

اگلے چار روز میں پاکستان کے جانباز سپاہیوں نے چھمب اور جوڑیاں پر قبضہ کر کے جو شاندار کارنامہ انجام دیا اس نے پوری قوم کے حوصلے بلند کر دیئے۔ پاکستان کا عسکری منصوبہ یہ تھا کہ اکھنور کے پہاڑی قلعہ اور چھاؤنی پر قبضہ کر کے سری نگر اور بھارت کے درمیان سب سے موثر سپلائی لائن کاٹ دی جائے ۴ ستمبر کو اکھنور کے دامن میں توپوں کی گھن گرج کے ساتھ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بھی گونج رہے تھے جان کی بازی لگا کر فتح مبین کا جھنڈا گاڑنے والے سرفروش اکھنور پر قبضہ کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔

اگر اکھنور پر پاکستان کا قبضہ ہو جاتا تو مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی عسکری پوزیشن بہت

کمزور پڑ جاتی۔ اس صورت حال سے بچنے کا بھارت کے سامنے واحد راستہ یہ تھا کہ جنگ کا دائرہ بین الاقوامی سرحدوں تک پھیلا دیا جائے۔ چنانچہ ۵ ستمبر کو آل انڈیا ریڈیو نے یہ خبر نشر کی کہ پاکستانی طیاروں نے امرت سر پر راکٹ برسائے ہیں۔ اس جھوٹی خبر سے بھارت کا مقصد پاکستان پر بھرپور حملے کا جواز پیدا کرنا تھا۔

بعض باخبر حلقوں کے مطابق بھٹو نے ایوب خاں کو یقین دلا رکھا تھا کہ پاک بھارت جنگ کا دائرہ بین الاقوامی سرحدوں تک نہیں پھیلے گا۔ یہ یقین بھٹو نے ایوب خان کو ان معلومات کی بنیاد پر دلایا تھا جو اسے امریکی ذرائع سے حاصل ہوئی تھیں۔ اس الزام کی صداقت کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ بات یقیناً بڑی حیرت انگیز ہے کہ اکھنور پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بناتے وقت ایوب خاں نے لاہور جیسے اہم سرحدی شہر کے مؤثر دفاع کے لئے مناسب انتظامات نہیں کئے تھے یہاں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیئے کہ بھٹو چونکہ وزیر خارجہ تھا اس لئے ایسے تمام معاملات میں اس کی رائے کو ایوب خاں ضرور اہمیت دیتے ہوں گے۔ جن کا تعلق دوسرے ممالک کے رویوں سے تھا۔ ممکن ہے کہ بھٹو نے خود براہ راست ایوب خاں کو اس قسم کی کوئی یقین دہانی نہ کرائی ہو اور یہ کام سی آئی اے کے ان ذرائع نے انجام دیا ہو جن سے بھٹو کے خفیہ روابط تھے۔ ایوب خاں کو مشکل میں پھنسائے بغیر انہیں ذلیل و رسوا کئے بغیر بھٹو اپنے عزائم کے لئے راستہ صاف نہیں کر سکتا تھا۔ اگر لاہور پر بھارتی فوجوں کا قبضہ ہو جاتا تو یہ ہماری تاریخ کا اتنا بڑا المیہ ہوتا کہ اس کی تلافی ناممکن ہوتی۔ اس صورت میں ایوب خاں کا حشر وہی ہوتا جو دسمبر ۱۹۷۱ء میں یحییٰ خاں کا ہوا۔ اس طرح قیادت کا جو خلا پیدا ہوتا اسے بھٹو کے ذریعے پر کیا جاتا۔ امریکہ بھارت پر "دباؤ" ڈال کر جنگ بندی کرا دیتا۔ بھارت کے ساتھ "شملہ سمجھوتہ" جیسا کوئی معاہدہ طے پا جاتا بھارتی فوجیں لاہور خالی کر دیتیں اور بھٹو جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں اعلان کرتا

کہ "میں نے ذلت و رسوائی کا داغ دھو دیا ہے۔ پاکستان کے دل لاہور کو بھارتی قبضے سے آزاد کرا کے میں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس پر پوری قوم کو فخر کرنا چاہیئے غلط قیادت کی وجہ سے افواجِ پاکستان کو اتنی بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا، لیکن میں پاکستان کو اتنا مضبوط بنا دوں گا کہ کوئی بھی اس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکے گا!"

○ ○
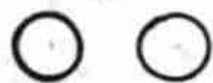
جو سکرین پلے بھٹو نے تیار کیا تھا اگر وہ اسی طرح کا تھا تو اسے زبردست مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

لاہور کے محاذ پر بالخصوص اور دوسرے محاذوں پر بالعموم فرزندانِ اسلام نے اپنے خون سے جرأت و شجاعت کی ایسی ناقابل فراموش داستانیں لکھیں کہ بدر و حنین، یرموک و قادسیہ اور قسطنطنیہ و یروشلم کے غازیوں اور شہیدوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ میجر عزیز بھٹی، میجر شفقت بلوچ، میجر خادم حسین، بریگیڈیئر شامی، میجر عباسی اور دوسرے ان گنت پاسبانانِ ملک و ملت نے سرحدوں پر خون کی ایسی لکیر کھینچ دی جسے عبور کرنا پتھروں کو پوجنے والے سورماؤں کے بس کی بات نہیں تھی۔ پاک فضائیہ کے شاہینوں نے معمولی درجے کے طیاروں کی مدد سے فضائی جنگوں میں ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ دنیا دنگ رہ گئی۔ بھارتی فضائیہ کی بیشتر قوت کو چند ہی دنوں میں تباہ کر دیا گیا۔ بھارتی بحریہ کی کمر بھی چند ہی لڑائیوں میں توڑ دی گئی بھارت کی فوجی قوت کا شیرازہ کچھ اتنی تیزی کے ساتھ بکھر گیا کہ اگر جنگ کچھ عرصہ اور جاری رہتی تو برصغیر کا وہ نقشہ نہ ہوتا جو آج ہے۔

یہ صورت حال امریکہ کے لئے بے حد تشویشناک تھی اور روس تو بھارت کا حلیف تھا۔ چنانچہ حسب توقع سلامتی کونسل کے ذریعے دونوں بڑی طاقتیں بھارت کو ایک

شرمناک شکست سے بچانے کے لئے حرکت میں آگئیں۔ بھارت کی شکست کا مطلب قطعی طور پر یہ ہوتا کہ اس خطے میں طاقت کا توازن "پاک چین اتحاد" کے حق میں ہو جاتا جس سے روس اور امریکہ دونوں کے مفادات کو زک پہنچتی۔ بھٹو کے لئے بھی بھارت کی شکست تباہ کن ہوتی۔ کیونکہ اس طرح ایوب خاں کو قومی ہیرو کی حیثیت حاصل ہو جاتی اور عوام کو اپنے پیچھے لگانے کا جو خواب بھٹو دیکھ رہا تھا وہ شرمندہ تعبیر ہونے سے رہ جاتا۔

چنانچہ ایوب خان پر بڑی طاقتوں کی طرف سے زبردست دباؤ پڑا۔ ۱۸ ستمبر ۶۵ء کو صبح دس بجے امریکی سفیر نے ایوب خان سے ملاقات کی۔ یہ وہ دن تھا جب پاکستان دفاعی جنگ جیتنے کے بعد بہت بڑے پیمانے پر جوابی حملہ کرنے والا تھا۔

اس سے پہلے ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خاں جنگ پھیلنے کی صورت میں چینی حمایت کی یقین دہانی حاصل کرنے کے پیکنگ گئے تھے۔ ان ہی دنوں چین نے بھارتی فوجیوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ چینی علاقے میں داخل ہو کر بھیڑیں چرا لے گئے ہیں۔ اس الزام کا مقصد چین بھارت سرحد پر کشیدگی پیدا کرنا تھا تاکہ بھارت وہاں سے اپنی فوجیں ہٹا کر پاکستان کے محاذ پر نہ لے جا سکے۔

بقول اصغر خان چینی لیڈروں نے ان سے کہا: "کیا آپ کو یقین ہے کہ ایوب خان واقعی جنگ جاری رکھنا چاہتے ہیں؟"

"اگر یہ یقین نہ ہوتا تو میں یہاں کیوں آتا۔ ہمیں جو برتری حاصل ہو چکی ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے گا۔" اصغر خاں نے جواب دیا۔

"ہم یہ بات خود ایوب خاں کے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔ پھر بھی ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ پاکستان ہماری دوستی حمایت اور امداد پر پورا پورا بھروسہ کر سکتا ہے۔" چینی لیڈروں نے کہا۔

یہ یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد اصغر خاں پیکنگ سے واپس آگئے۔
۱۷ ستمبر کی رات کو انہیں ایک باخبر شخصیت نے فون پر آگاہ کیا کہ جنگ بندی کا فیصلہ ہو چکا ہے اور صبح دس بجے امریکی سفیر ایوب خان سے ملاقات کر رہا ہے۔
اصغر خان کہتے ہیں:
"مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ کامیابی سے اس قدر قریب پہنچ کر ایوب خان واپس جانے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اگلی صبح میں ایوب خاں سے ملاقات کرنے کے لئے پہنچ گیا ملٹری سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ اس وقت ملاقات ممکن نہیں کیونکہ دس بجے امریکی سفیر آنے والا ہے۔ میں نے اصرار کیا کہ میں امریکی سفیر سے پہلے ایوب خاں کے ساتھ ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ ملٹری سیکرٹری نے ایوب خاں سے رابطہ قائم کیا اور مجھے مختصر ملاقات کی اجازت مل گئی۔ میں نے چھوٹتے ہی ایوب خاں سے سوال کیا کہ کیا واقعی جنگ بندی کا فیصلہ کیا جا چکا ہے اور امریکی سفیر اسی سلسلہ میں ملاقات کرنے آرہا ہے۔ ایوب خاں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا کہ فیصلے کا اختیار پاکستان کے پاس نہیں کیوں کہ بیرونی دباؤ بہت بڑھ گیا ہے۔ میں نے ایوب خاں کو بتایا کہ دباؤ تو ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے اسے قبول کیا جائے تو وہ واقعی ہوتا ہے اور اگر اسے قبول نہ کیا جائے تو وہ نہیں ہوتا۔ بھارت کو راہ راست پر لانے کا ایسا موقع قدرت شاید پھر کبھی ہمیں نہ دے۔ اس لئے اس موقع سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھانا اپنی تاریخ کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ اس بات پر ایوب خان نے بے بسی کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کہا کہ ہم اتنے زبردست دباؤ کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے"۔
پاکستان کے مردآہن ایوب خان درحقیقت بڑے کمزور آدمی تھے حب الوطنی کا شدید جذبہ رکھنے کے باوجود وہ ایسے آہنی فیصلے کرنے کی صلاحیت سے محروم

تھے جو قوموں کی تقدیر بدلا کرتے ہیں۔ اپنے لامحدود اختیارات کو جمہوری لباس پہنانے کی کوشش میں انہوں نے کنونشن مسلم لیگ کے نام سے جو سیاسی پلیٹ فارم بنایا تھا اس پر نظر آنے والی شخصیتیں زیادہ تر ان بدعنوان طبقوں سے تعلق رکھتی تھیں جن سے عوام کو نفرت تھی۔ ان بدعنوان شخصیتوں اور طبقوں کو ایوب خاں نے اپنی سیاسی طاقت کی بنیاد بنایا تھا اور ان کے مفادات کی خاطر ایوب خاں نے کچھ بنیادی اخلاقی اصولوں کی جو قربانی دی تھی اس کی وجہ سے ان کی اخلاقی جرأت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ جس رہنما میں اخلاقی جرأت کی کمی ہو اس سے نہ تو آہنی فیصلوں کی توقع رکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس بات کی کہ وہ کسی زبردست دباؤ کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

افواجِ پاکستان اس پوزیشن میں تھیں کہ بھارت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں، لیکن پاکستان کے سربراہ نے امریکہ کے دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ عسکری میدان میں جیتی ہوئی جنگ سیاسی میدان میں ہار دی گئی۔ قوم ابھی تک اس المناک صورت حال سے بے خبر تھی، لیکن بھٹو کو ہر بات کا علم تھا۔ جنگ کے عسکری نتائج اس کی توقعات کے بالکل برعکس برآمد ہوئے تھے مگر اس کا سیاسی کلائمکس بھٹو کے اندازوں اور مفادات کے عین مطابق تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جنگ بندی کا فیصلہ عوام کی مرضی اور امنگوں کے بالکل خلاف تھا اور جنگ کے دوران ایوب خاں کی قدر و منزلت میں جو اضافہ ہوا تھا وہ جنگ بندی کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اب یہ کام بھٹو کا تھا کہ وہ ایسی پرفارمنس دے کہ ایوب خاں کی شخصیت عوام کی نظروں میں بالکل گر جائے اور خود بھٹو کی اپنی شخصیت عوامی امنگوں کی ترجمان اور نقیب بن کر ابھرے۔

چنانچہ سلامتی کونسل میں بھٹو نے ایک ایسی جوشیلی تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ

اہلِ پاکستان کے دلی جذبات کی عکاسی کرتا تھا۔ اس جذباتی تقریر میں بھٹو نے تمام سفارتی آداب کو بالائے طاق رکھ کر "بھارتی کتے" جیسے الفاظ استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کیا اس تقریر کا آخر تک لب و لہجہ ایسا تھا جیسے پاکستان کسی بھی قیمت پر جنگ بندی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ مگر پھر بھٹو نے اچانک ایک کاغذ اٹھایا اور بڑے ڈرامائی انداز اور رندھی ہوئی افسردہ آواز میں اعلان کیا کہ اسے ابھی ابھی جنگ بندی قبول کر لینے کی ہدایت ملی ہے۔

یہ محض ڈرامہ تھا۔ بھٹو کو دو روز قبل ہی جنگ بندی کے فیصلے کا علم ہو چکا تھا بلکہ وہ خود اس فیصلے کا ایک مرکزی کردار تھا۔ مگر سلامتی کونسل میں اس فیصلے کا اعلان کرنے سے پہلے اس نے جان بوجھ کر یہ تاثر دیا کہ وہ جنگ بندی کے خلاف ہے۔

اس ڈرامے کا مقصد اہل پاکستان پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ ایوب خاں نے جنگ بندی کا فیصلہ بھٹو کو اعتماد میں لئے بغیر کیا تھا اور جہاں تک بھٹو کا تعلق تھا وہ ہر قیمت پر "بھارتی کتوں" کے خلاف جنگ جاری رکھنا چاہتا تھا۔

بھٹو کی یہ پرفارمنس یکم ستمبر والی پرفارمنس سے بھی زیادہ شاندار تھی اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میں بھی ان لاکھوں قوم پرستوں میں شامل تھا جو بھٹو کی اس زبردست پرفارمنس کی وجہ سے اس کے شیدائی بن گئے تھے۔

ایوب خاں کو بھٹو کے بارے میں کچھ شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ایس ایم ظفر کو بھی سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے بھیجا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھٹو اپنی چال بڑی کامیابی کے ساتھ چل گیا۔ جب بعد میں اسے ایوب خاں کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے بڑی ریاکاری سے کام لے کر اپنے آقا کو یہ یقین دلا دیا کہ اس نے یہ ڈرامہ کسی بری نیت سے نہیں بلکہ دنیا کو صرف یہ بتانے کے لئے کھیلا تھا کہ پاکستان اپنی خوشی سے نہیں بلکہ بڑی

طاقتوں کے غیر منصفانہ دباؤ کے تحت جنگ بندی قبول کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔ بھٹو کی قوتِ استدلال نے ایوب خان کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا۔

جنگ بندی کے سلسلہ میں سلامتی کونسل نے جو قرارداد منظور کی تھی اس کی رو سے فوجوں کی واپسی اور دوسرے امور پر تصفیہ کے لئے پاکستان اور بھارت کے درمیان مذاکرات ہونے تھے۔ جنگ میں پاکستان نے مقبوضہ کشمیر اور بھارت کے کافی بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ مقابلتاً پاکستان کا بہت کم علاقہ بھارت کے قبضے میں گیا تھا بھارتی فوجیوں کو بھی بڑی کافی تعداد میں پاکستان نے جنگی قیدی بنا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مجوزہ مذاکرات میں پاکستان ایک طاقتور فریق کی حیثیت سے شامل ہو رہا تھا اور پوری قوم بجا طور پر یہ تمنا رکھتی تھی کہ پاکستان اپنی اس حیثیت سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر بھارت کو مسئلہ کشمیر کے تصفیے پر مجبور کرے۔

مذاکرات میں مصالحتی کردار ادا کرنے کے لئے سوویت یونین نے جب اپنی خدمات پیش کیں تو ایوب خاں نے انہیں فوراً قبول کر لیا۔ سوویت یونین بھارت کا صرف دوست ہی نہیں باقاعدہ حلیف اور سرپرست بھی تھا۔ پھر بھی ایوب خاں نے اس کی مصالحتی پیشکش کو ٹھکرانا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ پاکستان کو امریکہ سے جو مایوسی ہوئی تھی اس کے پیش نظر سوویت یونین کے ساتھ بہتر روابط پیدا کرنے کے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا مناسب نہیں تھا۔ امریکہ نے جنگ کے دوران پاکستان کو اسلحہ اور فاضل پرزہ جات کی فراہمی روک کر عملاً واضح کر دیا تھا کہ سیٹو اور سنٹو جیسے معاہدے صرف امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے ہیں دوسری طرف سوویت یونین بھارت کو دھڑا دھڑ اسلحہ فراہم کر رہا تھا۔ ایوب خان نے سوچا کہ امریکہ جیسے دوست پر تو بھروسہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر کیوں نہ سوویت یونین کی بھارت نوازی کو اعتدال پر لانے کے لئے سوویت لیڈروں کی "نیک نیتی" پر اعتماد کا اظہار کیا

جاتے۔ چنانچہ ایوب خاں بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے ساتھ مذاکرات کے لئے تاشقند گئے اور اپنے ساتھ جو وفد لے گئے اس میں بھٹو بھی شامل تھا تاشقند کا نام پاکستان کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ بھٹو نے منزلِ اقتدار کی طرف اپنے طوفانی سفر میں جس کامیابی کے ساتھ اس نام کو اپنی سیاسی قوت کا سرچشمہ بنایا اس کا علم پوری دنیا کو ہے۔

---

# تاشقند کا بھوت

ایوّب خان کے لئے سوویت وزیر اعظم کا انکشاف بڑا سنسنی خیز اور تکلیف دہ تھا۔ اسی رات ایوّب خان کو معلوم ہوا کہ بھٹو اور لال بہادر شاستری کی ملاقات ہو چکی ہے۔

جنوری ۱۹۶۶ء کے اوائل میں تاشقند کا تاریخی شہر جن سفارتی و سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ان کے مرکزی کردار سوویت وزیر اعظم کوسیگین، بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور صدر پاکستان ایوب خاں تھے۔ مذاکرات کے کئی دور ہوتے لیکن پاکستان اور بھارت کے درمیان سمجھوتے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ بھارت مذاکرات کو صرف فوجوں کی واپسی اور جنگی قیدیوں کے تبادلے تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اور پاکستان اُس مسئلے کو مذاکرات کی بنیاد بنانا چاہتا تھا جس کی وجہ سے دونوں ممالک کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ ایوب خاں کو اگر یہ توقع تھی کہ برصغیر میں حالات کو معمول پر لانے کے لئے سوویت یونین اپنے حلیف بھارت کے رویے میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش کرے گا تو انہیں زبردست مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک سٹیج پر ایوب خاں نے اخبار نویسوں کے سامنے واضح الفاظ میں اپنی بددلی کا اظہار کر دیا اور کہا کہ بھارت کی ہٹ دھرمی کے پیش نظر مذاکرات کو جاری رکھنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ عین اس وقت جب مذاکرات کی ناکامی یقینی نظر آتی تھی تو سوویت وزیر اعظم نے لال بہادر شاستری اور ایوب خاں کے ساتھ الگ الگ کئی ملاقاتیں کیں اور ایک ایسے فارمولے کی بنیادیں تلاش کر لی گئیں جس پر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے کی گنجائش پیدا کی جا سکتی تھی۔

اس مسودے کو آخری شکل دینا کافی مشکل کام تھا کیوں کہ اس قسم کے معاہدوں میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور ہر فریق ہر لفظ اور ہر جملے کی تشریح اپنے مفادات کی روشنی میں کرنے کی کوشش کرتا ہے پاکستان کی طرف سے جو مسودہ پیش کیا گیا اسے بھارت نے مسترد کر دیا اور جو مسودہ بھارت نے پیش کیا اسے پاکستان نے قبول نہ کیا۔ چنانچہ سوویت وزیر اعظم نے دونوں مسودوں کی روشنی میں اپنا مسودہ تیار کیا اور اسے ایوب خاں کے حوالے کر دیا اس مسودے میں کشمیر کی متنازعہ فیہ حیثیت کو بالواسطہ طور پر تسلیم کیا گیا تھا اور اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ فریقین تمام مسائل باہمی بات چیت کے ذریعے طے کریں۔ اس حد تک تو یہ مسودہ پاکستان کے لئے قابلِ قبول تھا مگر دو باتیں ایسی تھیں جو پاکستان کے نقطۂ نظر کے خلاف جاتی تھیں ایک تو یہ کہ فوجوں کی واپسی اور جنگی قیدیوں کے تبادلے جیسے مسائل پہلے طے کر لئے جائیں اور باقی معاملات پر بات چیت بعد میں ہو اور دوسری بات یہ کہ فوجوں کی واپسی کا اطلاق صرف بین الاقوامی سرحدوں تک محدود نہ ہو بلکہ کشمیر میں بھی دونوں ملکوں کی فوجوں کو اس جنگ بندی لائن پر واپس لے جایا جائے جو اس جنگ سے پہلے قائم تھی۔ گویا اس مسودے کی رو سے پاکستان کو ان کامیابیوں سے دستبردار ہونا پڑتا تھا جو اسے چھمب اور جوڑیاں کے علاقے میں حاصل ہوئی تھیں۔ ایوب خان نے ان شقوں کے بارے میں اپنے اعتراضات سوویت وزیر اعظم کے سامنے رکھے تو کوسیگن نے انہیں یقین دلایا کہ اگر یہ کانفرنس کامیاب ہو گئی تو سوویت حکومت آئندہ بھی دونوں ملکوں کے درمیان تمام مسائل منصفانہ بنیادوں پر حل کرانے کی کوششیں جاری رکھے گی ایوب خان نے جواباً یہ پیش کش کی کہ اگر مجوزہ مسودے کی بعض شقوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مشروط کر دیا جائے تو وہ اسے قبول

کریں گے۔ کوسیگن نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ لال بہادر شاستری نے انہیں یقین دلایا ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ مکمل تصفیہ کا پُرخلوص ارادہ رکھتے ہیں، لیکن مشترکہ اعلامیہ میں وہ کسی ایسی بات کو شامل نہیں ہونے دیں گے جس کی وجہ سے انہیں بھارتی عوام کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے چنانچہ بہتر یہی ہے کہ پاکستان مفاہمانہ رویہ اختیار کر کے اس مسودے کو قبول کر لے۔

ایوب خان کے سامنے اب صرف دو راستے تھے۔

۱۔ سوویت وزیر اعظم کے مسودے کو مسترد کر دیا جائے اور تاشقند کانفرنس کی ناکامی کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے۔

اس صورت میں بھارت کی طرف سوویت یونین کے واضح جھکاؤ کا اور زیادہ بڑھ جانا یقینی تھا۔

۲۔ سوویت وزیر اعظم کے مسودے کو بادل نخواستہ قبول کر لیا جائے اور روسی حکومت کی اس یقین دہانی پر بھروسہ کیا جائے کہ وہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تمام مسائل کو حل کرانے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گی۔

اس صورت میں پاکستان کو کم از کم یہ فائدہ تو پہنچ سکتا تھا کہ آئندہ سوویت یونین اپنی بھارت نوازی میں ایک محتاط حد سے آگے بڑھنے سے گریز کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

اگر ایوب خاں کو امریکہ کی حمایت کی امید ہوتی تو وہ شاید اپنے اصل موقف پر قائم رہتے، لیکن اب جو صورت حال تھی اس میں سخت رویہ اختیار کرنے کا مطلب دونوں بڑی طاقتوں کی مشترکہ ناراضگی کا خطرہ مول لینا تھا۔ چنانچہ ایوب خاں نے سوویت وزیر اعظم سے درخواست کی کہ انہیں اپنے وفد کے باقی ارکان سے مشورہ کرنے کی مہلت دی جائے۔

پاکستانی وفد کے ارکان میں بھٹو بھی تھا۔ وہ پاکستان کا وزیر خارجہ تھا۔ اس لئے

یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ایوب خاں نے اس سے مشورہ نہیں کیا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ سوویت مسودے میں چند الفاظ اور جملوں کے ردّ و بدل سے پاکستان نے جو آخری مسودہ تیار کیا وہ خود بھٹو کی اپنی تحریر میں تھا۔ یہ مسودہ آج بھی اس وفد میں شامل ایک ایسے شخص کے پاس محفوظ ہے جو بھٹو کے برسر اقتدار آنے کے بعد کچھ عرصے تک تو زیر عتاب رہا۔ لیکن اس کے بعد جس پر بڑی فیاضانہ نوازشیں ہوئیں۔

اس نظر ثانی شدہ مسوّدے کی نقل کوسیگن کے حوالے کر دی گئی سوویت وزیر اعظم نے لال بہادر شاستری کے ساتھ ملاقات کی اور تھوڑی دیر بعد ایوب خاں کو بھی اس ملاقات میں شامل کر لیا گیا۔ وہ سمجھوتہ طے پا چکا تھا جو "اعلان تاشقند" کے نام سے مشہور ہوا اور جسے بھٹو نے اپنے قومی امیج کی تشکیل اور ایوب خان کی قومی حیثیت کے قتل میں ایک انتہائی مؤثر اور طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

یہ ایوب خاں کی بدقسمتی تھی کہ سمجھوتے کے اعلان کے فوراً بعد لال بہادر شاستری کا انتقال ہو گیا۔ ایسی ہی بدقسمتی کا سامنا ایوب خاں کو چند برس قبل کرنا پڑا تھا جب پنڈت جواہر لال نہرو تصفیۂ کشمیر کے سلسلے میں بعض عملی اقدامات کرنے کے بعد اچانک انتقال کر گئے تھے۔

شاستری کی موت بہرحال ایوب خاں کے سیاسی زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

اعلانِ تاشقند پر دستخط کرنے سے پہلے ایوب خاں اور شاستری کے درمیان سمجھوتے پر عملدر آمد کے سلسلہ میں جو بھی باتیں زبانی طے ہوئی تھیں ان کا ایک بنیادی گواہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا اور اب اعلانِ تاشقند کی حیثیت الفاظ اور جملوں سے زیادہ نہیں تھی۔ شاستری کی موت نے ان الفاظ اور جملوں کو بے جان بنا کر رکھ دیا تھا اور ایوب خاں تنہا ان میں جان نہیں ڈال سکتے تھے۔

یوں لگتا ہے جیسے قدرت خود بھٹو کے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لئے راستہ ہموار کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ قدرت نے ایوب خاں سے یکے بعد دیگرے کئی ایسی غلطیاں کرائیں جن سے بھٹو نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

ایوب خاں کی پہلی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات کو قوم سے خود خطاب کرنے کی بجائے یہ موقع بھٹو کو دیا۔

ایوب خاں کی دوسری غلطی یہ تھی کہ انہوں سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے بھٹو کو بھیجا جس نے اپنا "قومی امیج" بنانے کی مہم اس وقت تک کھل کر شروع کر دی تھی۔

یہ دو غلطیاں ایوب خاں نے اس اعتماد کی وجہ سے کیں جو انہیں بھٹو کی ذات پر تھا۔

لیکن ایوب خان نے جو تیسری غلطی کی اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔

اور وہ غلطی یہ تھی کہ اُدھر ایوب خان تاشقند میں لال بہادر شاستری کی ارتھی کو کندھا دے رہے تھے اور اِدھر بھٹو پاکستان پہنچ کر یہ اعلان کر رہا تھا کہ روسی سرزمین پر پاکستانی مفادات کا سودا کر کے صدر پاکستان نے قوم کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ بھٹو باقی وفد سے پہلے پاکستان پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوا؟ ایوب خاں نے اسے دوسروں سے پہلے "تاشقند چھوڑنے کی اجازت کیوں دی؟ - یہ بڑے ہی اہم سوالات ہیں"

○ ○

جب ایوب خان افقِ سیاست سے غائب ہو چکے تھے اور یحییٰ خان کے زوال کے بعد بھٹو مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہو چکا تھا تو ایک بزرگ صحافی نے ایوب خاں سے ایک ملاقات کے دوران اعلانِ تاشقند کے بارے میں اصل

حقائق معلوم کرنا چاہیے۔ ایوب خاں نے اس صحافی کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے تو گریز کیا، لیکن پھر کچھ باتیں بتانے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ باتیں ان روایتوں سے زیادہ مختلف نہیں تھیں جو ایوب خاں کے قریبی حلقوں سے سامنے آئیں۔ بھٹو کے طالب علم کی حیثیت سے میری بھی ایک تھیوری ہے جو ان باتوں اور روایتوں سے بڑی حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ یہاں میں یہ تھیوری پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

تاشقند مذاکرات تین مرتبہ تعطل کا شکار ہوئے اور تینوں مرتبہ سوویت وزیر اعظم نے مداخلت کر کے کانفرنس کو ناکامی سے بچایا کیونکہ روسی لیڈروں نے "ایشیائی معاہدۂ امن" کا جو منصوبہ تیار کر رکھا تھا اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی ختم کی جائے اور کشیدگی ختم کرنے کا کریڈٹ بھی سوویت یونین کو حاصل ہو۔

مذاکرات کے درمیانی مرحلہ پر ایک اجلاس میں پاکستان اور بھارت کے وفود کے تمام ارکان شرکت کر رہے تھے۔ روسی وزیر اعظم بھی موجود تھے۔ کسی اہم نکتے پر وفود کے قائدین اور کوسیگن کے درمیان بحث ہو رہی تھی۔ بھٹو نے اس بحث میں دو تین مرتبہ مداخلت کی اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا چاہا۔ اس کی یہ متواتر مداخلت کوسیگن کو پسند نہ آئی اور آخر روسی وزیر اعظم نے ذرا سخت لہجے میں بھٹو کو کہہ ہی دیا کہ وہ معاملے کو الجھانے کی بجائے خاموشی اختیار کرے تو بہتر ہوگا۔

ایوب خاں اپنے وزیر خارجہ کی یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکے اور یہ کہہ کر اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے کہ "توہین بھٹو کی نہیں پاکستان کی گئی ہے اور چھوٹا ملک ہونے کے باوجود پاکستان عزتِ نفس سے عاری نہیں"۔

اس غیر متوقع صورت حال کے تھوڑی دیر بعد سوویت وزیر اعظم نے جا کر تنہائی میں ایوب خاں سے ملاقات کی اور اظہارِ معذرت کے ساتھ صدر پاکستان

کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ بھٹو پر قطعاً اعتماد نہ کریں۔
"شاید آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا وزیر خارجہ چین کا حامی ہے اور اسی وجہ سے ہم اسے پسند نہیں کرتے، لیکن ہماری اطلاعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ آپ کا وزیر خارجہ بنیادی طور پر امریکہ کا آدمی ہے اور سی آئی اے کے لیے کام کر رہا ہے موجودہ مذاکرات کو وہ چین کی وجہ سے نہیں بلکہ امریکہ کے اشارے پر ناکام بنانے کی کوشش کر رہا ہے آپ اس سے جس قدر محتاط رہیں گے آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔"
ایوب خاں کے لیے سوویت وزیر اعظم کا یہ انکشاف بڑا سنسنی خیز اور تکلیف دہ تھا۔ اسی روز انہیں ایک ایسی بات کا علم ہوا جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ بھٹو خفیہ طور پر تنہائی میں لال بہادر شاستری کے ساتھ ملاقات کر چکا تھا۔
ایوب خاں نے اس بارے میں بھٹو سے استفسار کیا تو اس نے صاف انکار کرتے ہوتے وفد کے بعض دوسرے ارکان پر الزام لگایا کہ وہ اس کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں۔ اپنی صفائی میں بھٹو نے یہ دلیل بھی دی کہ مذاکرات میں بھارت کے خلاف اتنا سخت رویہ اختیار کرنے کے بعد اسے لال بہادر شاستری سے خفیہ ملاقات کی کیا ضرورت تھی۔
بظاہر ایوب خاں مطمئن ہو گئے لیکن لال بہادر شاستری کے ساتھ بھٹو کی خفیہ ملاقات کا علم انہیں جس ذریعے سے ہوا تھا وہ بڑا ہی مستند تھا۔ پھر کوسیگن نے بھی جو باتیں انہیں بتائی تھیں ان کی وجہ سے ایوب خاں کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے ایک اور بات بھی قابلِ غور تھی اور وہ یہ کہ مذاکرات کے بارے میں بھٹو نے بڑے متضاد رویے اختیار کر رکھے تھے جب وہ اجلاس میں شرکت کرتا تو بھارت کے ساتھ معاہدے کے سلسلے میں

اس کی شرائط خاصی سخت ہوتیں، مگر پاکستانی کیمپ میں اس نے خاصا معتدل اور متوازن نقطۂ نظر اپنا رکھا تھا ان تمام باتوں نے ایوب خاں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ان کا وزیر خارجہ کوئی خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔ پھر بھی انہوں نے فوری طور پر بھٹو کو یہ احساس دلانا مناسب نہ سمجھا کہ وہ اپنے صدر کے اعتماد سے محروم ہو چکا ہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس بارے میں مناسب کارروائی وہ وطن واپس پہنچنے کے بعد کریں گے

مگر بھٹو بے وقوف نہیں تھا اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ اس کا پول کھل چکا ہے اور ایوب خاں کے ذہن میں اس کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہو چکے ہیں اسکے سامنے واحد راستہ اب یہ تھا کہ ایوب خاں کے عتاب کا انتظار کرنے کی بجائے فوری طور پر ایسا اقدام کرے جس سے وہ خود تو قوم کی نظروں میں سرخرو ہو جائے اور ایوب خاں کے خلاف غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھے۔

سی آئی اے کی طرف سے بھٹو کو یقیناً یہی ذمہ داری سونپی گئی ہوگی کہ وہ تاشقند مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کی پوری کوشش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاکرات کے دوران اس نے متعدد مرتبہ سوویت وزیر اعظم کی منشا اور مزاج کے خلاف رویہ اختیار کیا اور ایک مرتبہ تو ایسی صورت حال پیدا کر دی کہ مذاکرات تعطل کا شکار ہو گئے۔

لیکن بھٹو صرف سی آئی اے کے مفادات کے لئے ہی کام نہیں کر رہا تھا خود اس کے اپنے مفادات بھی تھے جن کا تقاضہ یہ تھا کہ مذاکرات ناکام نہ ہوں اور کسی نہ کسی طرح ایسا سمجھوتہ طے پا جائے جو پاکستانی عوام کی امنگوں کے خلاف ہو تاکہ ایوب خاں کے خلاف پائی جانے والی بے چینی کو ایسی قومی تحریک میں ڈھالا جا سکے جس کی قیادت بھٹو کے اپنے ہاتھوں میں ہو۔ بھٹو کے بارے میں یہ تاثر بالکل غلط ہے کہ وہ سی آئی اے کا ایجنٹ تھا۔ بھٹو ہمیشہ صرف اپنے مفادات کا ایجنٹ اور اپنی خواہشات کا غلام رہا ہے۔ اس نے زندگی میں جو کچھ بھی کیا صرف اپنے مقاصد کے حصول، اپنے

عزائم کی تکمیل اور اپنے جذبۂ خود پرستی کی تسکین کے لئے کیا بھٹو جیسے لوگ کبھی کسی کے وفادار اور کبھی کسی دوست نہیں ہوتے۔ وہ اپنے اندھے مجنونانہ مفادات پر ہر رشتے، ہر اصول، ہر دوستی اور ہر وفاداری کو قربان کر دیتے ہیں۔ اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے وہ قوموں کی تقدیر سے بھی کھیل جانے سے گریز نہیں کرتے۔ جب بھٹو کو یقین ہو گیا کہ مشرقی پاکستان کی موجودگی میں وہ مسند اقتدار تک نہیں پہنچ سکتا تو اس نے بڑی بے رحمی سے پاکستان کا وہ بلذو کاٹ کر پھینک دیا۔)

بھٹو ان معنوں میں سی آئی اے کا ایجنٹ ہرگز نہیں تھا جن معنوں میں یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس نے سی آئی اے سے روابط ضرور قائم کئے تھے مگر اس کا مقصد ان روابط کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرنا تھا۔ سی آئی اے ایوب خاں سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی اور بھٹو ایوب خاں کی جگہ لینا چاہتا تھا۔ اس لئے بھٹو نے سی آئی اے کے لئے کام کرتے ہیں کوئی باک تصور نہ کیا۔ مگر تاشقند مذاکرات کے معاملے میں امریکہ کے مفادات اور بھٹو کے مفادات میں واضح تضاد تھا امریکہ اپنے حریف سوویت یونین کی اس سفارتی پیش قدمی کو ناکام دیکھنا چاہتا تھا اور بھٹو یہ چاہتا تھا کہ سوویت کوششوں کے نتیجہ میں ایسا معاہدہ طے پا جائے جسے ایوب خان کی کردار کشی کے لئے استعمال کیا جا سکے۔

امریکی مفادات اور بھٹو کے مفادات کے درمیان پائے جانے والے اس تضاد سے ان متضاد رویوں کی وضاحت ہو جاتی ہے جو بھٹو نے مذاکرات کے دوران اختیار کئے۔ امریکہ کو یہ تاثر دینا ضروری تھا کہ بھٹو مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہے، لیکن زیادہ ضروری بھٹو کے اپنے مفادات تھے۔

بھٹو نے لال بہادر شاستری سے ملاقات کیوں کی؟

اس کا قطعی جواب بھٹو خود ہی دے سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس نے شاستری

سے ملاقات صرف یہ جاننے کے لئے کی ہو کہ بھارتی حکومت ایوب خان کے دباؤ کا مقابلہ کس حد تک کر سکتی ہے اور کہیں اس بات کا امکان تو نہیں کہ ایوب خاں مذاکرات میں کوئی ایسی "رعایت" حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو ان کے وقار میں اضافے کا باعث ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ بھٹو نے شاستری کو زیادہ سے زیادہ سخت رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہو۔ اس نے ہندو لیڈر کو یہ سمجھایا ہو کہ ایوب خان مذاکرات کی ناکامی کا اعلان کر کے سوویت حکومت کی ناراضگی کا خطرہ مول لینے کی پوزیشن میں نہیں اس لئے بھارتی وزیراعظم کو ایوب خاں کا دباؤ قبول کرنے کی بجائے خود ایوب خاں پر دباؤ ڈالنا چاہیئے۔

یہاں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شاستری نے کوسیگن کو اس ملاقات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہو جو بھٹو نے ان کے ساتھ کی تھی اور سوویت وزیراعظم نے سوچا ہو کہ "یہ شخص ایک طرف تو بھارتی وزیراعظم کے ساتھ خفیہ ملاقات کر کے اسے سخت رویہ اختیار کرنے کا مشورہ دے چکا ہے اور دوسری طرف خود مذاکرات میں پاکستان کے رویے کو زیادہ سے زیادہ سخت بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد کانفرنس کو ناکام بنانا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا تعلق سی آئی اے سے ہے"

یہ تمام امکانات اپنی جگہ بڑے اہم ہیں لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ جو معاہدہ بالآخر طے پایا وہ بھٹو کی منشا اور مفادات کے عین مطابق تھا۔ اعلانِ تاشقند کا آخری مسودہ تیار کرتے وقت اسے یقیناً یہ اطمینان ہو گا کہ اس معاہدے کو بڑی کامیابی کے ساتھ ایوب خاں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایوب خاں کو وہ یہی مشورہ دیتا رہا تھا کہ اگر پاکستان اپنے مطالبات نہ بھی منوا سکے تو بھی سوویت یونین

کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مذاکرات کو کامیابی سے ہمکنار کرانا ضروری ہے۔
اعلان تاشقند کے فوراً بعد شاستری کی موت نے بھٹو کے کام کو بہت آسان بنا دیا۔ اسے اس بات کا اندازہ تو ہو چکا تھا کہ ایوب خان کے ذہن میں اس کے متعلق تشکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں گویا ایوب خاں کو الوداع کہنے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ وہ خود اس معاملے میں پہل نہ کرتا تو بھی اسے ایوب خان کے عتاب کا نشانہ بن کر حکومت سے الگ ہونا پڑتا اور پہل کرنے میں بڑے فائدے تھے۔ پہل کر کے ایوب خاں پر بڑا بھرپور وار کیا جا سکتا تھا۔ ایسا وار کہ ایوب خاں کو بھٹو کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی بجائے خود اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہونا پڑتا۔
پہل کرنے کا موقع اگر ایوب خاں کو دے دیا جاتا تو بھٹو اعلان تاشقند کے ہتھیار کو مؤثر طور پر استعمال کرنے کی پوزیشن میں نہ رہتا۔ عوام ایوب خاں کی باتوں پر زیادہ اعتبار کرتے اور بھٹو کے بارے میں یہ تاثر پیدا ہو جاتا کہ وہ "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے مترادف اپنا جرم ایوب خان کے سر پہ تھوپ رہا ہے۔
چنانچہ بھٹو کسی نہ کسی طرح ایوب خان اور باقی وفد سے پہلے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور یہاں آ کر اس نے بڑے جذباتی انداز میں اعلان کیا کہ تاشقند سمجھوتے میں پاکستانی عوام کی امنگوں اور مفادات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ایوب خاں نے بھٹو کو سب سے پہلے وطن پہنچنے کی اجازت کیوں دی؟ بھٹو کو اپنی چال چلنے کا موقع کیوں فراہم کیا گیا؟۔ جب بھٹو کی اصلیت ایوب خاں پر کھل ہی چکی تھی تو انہیں یہ بھی سوچنا چاہیئے تھا کہ ان کا وزیر خارجہ باقی وفد سے پہلے تاشقند سے رخصت ہونے کے لئے کیوں بے چین ہے؟
معلوم ہوتا ہے کہ قدرت ایوب خاں کے زوال اور بھٹو کے عروج کا فیصلہ

کر چکی تھی اور ایوب خان بڑی سنگین غلطیوں کا ارتکاب کر کے خود ہی اپنے آپ پر زوال کے دروازے کھول رہے تھے۔

○ ○

تاشقند سے واپس لوٹنے کے بعد ایوب خان کو فوراً احساس ہو گیا کہ بھٹو بڑی خطرناک چال چل گیا ہے۔ عام حالات میں بھی اعلان تاشقند کے خلاف عوامی ردِ عمل خاصا شدید ہوتا اور اب تو خود ایوب خاں کے وزیر خارجہ نے کہہ دیا تھا کہ جو کچھ پاکستان نے میدانِ جنگ میں حاصل کیا تھا وہ اس معاہدے کے ذریعے ضائع کر دیا گیا ہے۔

شدید غم و غصے میں ایوب خاں اپنے احسان فراموش "منظور نظر" کے خلاف بڑا سخت قدم اٹھانا چاہتے تھے، لیکن ان کے مشیروں نے انہیں سوجھ بوجھ سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ ان مشیروں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر فوری طور پر بھٹو کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی تو عوامی جذبات مشتعل ہو جائیں گے اور بھٹو کا امیج ایسے قومی ہیرو کا بن جائے گا جس نے ملک و ملت کی سربلندی کے لئے حکومت کے عتاب کو دعوت دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین نے رائے دی کہ پہلے بھٹو کو مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ اعلان تاشقند کے حق میں بیان دے کر اپنے پچھلے موقف کی تردید کرے اس طرح عوام کی نظروں میں بھٹو کی پوزیشن خراب ہو جائے گی اور کچھ وقفہ دینے کے بعد جب اسے سبکدوش کیا جائے گا تو وہ رائے عامہ کو حکومت کے خلاف اتنی کامیابی کے ساتھ نہیں بھڑکا سکے گا جتنی کامیابی کے ساتھ اب بھڑکا سکتا ہے۔

ایوب خاں کو یہ تجویز پسند آگئی اور فوراً ہی بھٹو سے رابطہ قائم کیا گیا جولاڑکانہ

جا بیٹھا تھا اور وہاں حکومت کے ردعمل کا انتظار کر رہا تھا۔ بھٹو کا خیال تھا کہ ایوب خاں اپنے آمرانہ مزاج کے مطابق کوئی سخت قدم اٹھائیں گے۔ چنانچہ وہ ایوب خاں کے ہر متوقع اقدام کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ طلبا کی مختلف تنظیموں سے روابط اس نے پہلے ہی قائم کر رکھے تھے اور اسے پورا اعتماد تھا کہ نوجوان نسل میں اعلانِ تاشقند کے خلاف شدید نفرت پیدا کرنا اور پھر اس نفرت کو ایوب خان کے خلاف ایک ملک گیر ایجی ٹیشن کی شکل دینا اس کے لئے مشکل بات نہیں ہو گی۔

لیکن ایوب خاں نے جو قدم اٹھایا وہ بھٹو کی توقعات کے خلاف تھا۔ ایوب خاں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ جو کچھ ہوا تھا اسے بھلا دیا جائے اور ملک کے وسیع تر مفاد کی خاطر بھٹو وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے ایسا بیان جاری کرے جس سے اعلانِ تاشقند کے بارے میں پیدا ہونے والی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔ ایوب خاں نے بھٹو کو پیغام پہنچایا کہ اگر وہ مطلوبہ بیان جاری کر کے اپنی وفاداری ثابت کر دے تو اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی ایک اور ذریعے سے بھٹو کو یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اس نے مطلوبہ بیان جاری نہ کیا تو ایوب خاں اسے سازشی قرار دے کر اس کے خلاف سخت ترین کارروائی کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

ایجی ٹیشن کا منصوبہ بنانا اور عوامی انقلاب کی رہنمائی کا خواب دیکھنا ایک بات تھی اور عملاً ایک آمرِ مطلق کی بھرپور طاقت سے ٹکرانا دوسری بات تھی۔ بھٹو اچانک اپنے منصوبے کی کامیابی کے امکانات کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو گیا۔ ایوب خاں کی دھمکی نے اس کے حوصلے پست کر دیئے۔ فطرتاً بزدل ہونے کی وجہ سے اس نے عافیت اسی بات میں سمجھی کہ فی الحال ایوب خاں سے ٹکرانے سے گریز کیا جائے اور کچھ وقت اور حکومت میں رہ کر عوام کے ایسے طبقوں

کے ساتھ روابط بڑھائے جائیں جن پر اسٹیبلشمنٹ کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔
چنانچہ بھٹو نے مطلوبہ بیان جاری کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی کہ ایوب خاں کوئی ایسی بات منظر عام پر نہیں لائیں گے جس سے بھٹو کے قومی امیج کو گزند پہنچنے کا خطرہ ہو۔ بھٹو کا اشارہ اس ملاقات کی طرف تھا جو اس نے تاشقند میں لال بہادر شاستری کے ساتھ کی تھی۔
ایوب خان نے اپنے وزیر خارجہ کی یہ شرط منظور کر لی اور یوں بھٹو نے وہ بیان جاری کیا جس میں اعلان تاشقند کو حکومت کی ایک عظیم سفارتی کامیابی قرار دیا گیا تھا اس بیان میں بھٹو نے واضح الفاظ میں کہا کہ اس کے ساتھ غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں ورنہ وہ ایک ایسے معاہدے پر نکتہ چینی کیسے کر سکتا ہے۔ جس کو عملی شکل دینے کے عمل میں اس نے خود وزیر خارجہ کی حیثیت سے بھرپور شرکت کی تھی۔ بھٹو نے یہ بھی وضح کیا کہ اعلانِ تاشقند میں کشمیر کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا گیا اور بھارت بات چیت کے ذریعے اس تنازعہ کا تصفیہ کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔
مجھے وہ رات اچھی طرح یاد ہے۔ جب بھٹو کا یہ بیان جاری ہوا۔ اس زمانے میں بھی میں روزنامہ کوہستان کا ایگزیکٹو ایڈیٹر تھا۔ میں اپنے کمرے میں اخبار کے نیوز ایڈیٹر محبوب علی خاں کے ساتھ دن کی اہم خبروں کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہا تھا کہ ایک سب ایڈیٹر نے آکر بتایا کہ کریڈ پر وزیر خارجہ کا نہایت اہم بیان آرہا ہے۔
میں نے نیوز روم میں جا کر یہ بیان پڑھا تو ایک دم سناٹے میں آ گیا مجھے بھٹو سے یہ امید نہیں تھی۔ میں اسے اپنی تمام تر ملی امنگوں کا نقیب اور مستقبل کے عظیم تر پاکستان کا معمار بنا چکا تھا۔ میرے نزدیک ایوب خاں نے جنگ بندی قبول کر کے اہل پاکستان کو اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھنے والے برہمنوں پر اپنی فیصلہ کن برتری ثابت کرنے کے سنہری موقع سے محروم کر دیا تھا۔ ایوب خاں کی شخصیت میری نظروں میں کمزوری

بزدلی اور بے غیرتی کی علامت بن چکی تھی اور یہ بات میرا جزوِ ایمان بن چکی تھی کہ پاکستان کو ایک کمزور، بزدل اور بے غیرت آمر کی ضرورت نہیں تھی جس نے تاشقند جا کر شکست خوردہ بھارت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ پاکستان کو ضرورت تھی ایک ایسے غیور جرأتمند اور جوشیلے رہنما کی جو ستاروں پر کمندیں ڈال سکے اور جو بلا خوف و خطر ہر قسم کے دباؤ سے آزاد ہو ببانگ دہل دنیا کو بتا سکے کہ پاکستان کے کروڑوں مسلمان اپنے نظریہ حیات کی سربلندی کے لئے ایک ہزار سال تک بھارت کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے تیار ہیں۔

یہ صرف میرے ہی جذبات نہیں تھے اپنی تاریخ پر فخر کرنے والے ہر نوجوان کے جذبات تھے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ نے ان جذبات کو دہکتے ہوئے الاؤ کی سی حدت اور شدت عطا کر دی تھی۔ میں یہاں ان جذبات کا ذکر کرنا اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ بھٹو کی ہوسِ اقتدار ایک ایسے انجن کی مانند تھی جسے ایندھن کی ضرورت ہو اور میرے اور وطنِ عزیز کے دوسرے لاکھوں جوشیلے نوجوانوں کے ان ہی جذبات نے بھٹو کو مطلوبہ ایندھن فراہم کیا۔

لیکن وہ بیان یقیناً اس بھٹو کا نہیں تھا جس سے مجھ جیسے لاکھوں جذباتی قوم پرست اپنی تمام تر امیدیں وابستہ کر چکے تھے۔ میں نے دو ہی روز قبل ایک طویل مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "اعلان میونخ" یہ مضمون آنے والے سنڈے ایڈیشن میں نمایاں طور پر شائع ہونے والا تھا۔ اس مضمون میں بھٹو کو میں نے پاکستان کا چرچل قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ جس طرح چیمبرلین نے میونخ میں ہٹلر کے سامنے ہتھیار ڈال کر برطانوی مفادات کو دفن کر دیا تھا اسی طرح ایوب خان نے تاشقند میں شاستری کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی قوم کی امنگوں کے ساتھ غداری کی تھی اور جس طرح چیمبرلین کو ہٹا کر برطانوی قوم نے چرچل کی قیادت میں اپنے وقار کی بحالی کی

جنگ لڑی تھی اسی طرح پاکستانی قوم بھی ایوب خاں سے نجات حاصل کر کے بھٹو کی قیادت میں بھارتی سامراج کے خلاف اپنی عظمت اور برتری کی جنگ فیصلہ کن فتح تک لڑ سکتی تھی
اپنے اس مضمون میں میں نے جو کچھ لکھا تھا۔ بھٹو کا بیان اس کی نفی کر رہا تھا۔
واقعات کے آثار چڑھاؤ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا تو مشکل نہیں تھا کہ یہ بیان بھٹو نے حکومت کے زبردست دباؤ کے تحت دیا ہے۔ مگر میرے لئے پریشان کن سوال یہ تھا کہ جس شخص کو میں نے اپنا لیڈر بنایا تھا کیا وہ اصولوں کی خاطر دباؤ کا مقابلہ کرنے کی قوت اور صلاحیت نہیں رکھتا؟ آنے والے ایام میں یہ سوال بار بار میرے ذہن میں ابھرتا رہا اور ہر بار میں نے اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ طوفانوں سے ٹکرانے والوں کو بعض اوقات مصلحتوں سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خان کی پوری پروپیگنڈہ مشینری یہ ثابت کرنے کے لئے حرکت میں آ چکی تھی کہ جس طرح رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے دوررس اور وسیع تر مفاد کے لئے کفارِ مکہ کے ساتھ صلح حدیبیہ پر دستخط کئے تھے اسی طرح ایوب خان نے بھی اہل پاکستان کے دوررس اور وسیع تر مفاد کے لئے بھارت کے ساتھ تاشقند کا معاہدہ کیا تھا۔ پیغمبر اسلام اور انسانی تاریخ کے سب سے بڑے انقلاب کے بانی قائد اور معمار کے ساتھ ایک ہی ضمن میں ایک کمزور اور بزدل آمر کا نام لینا میری اور مجھ جیسے لاکھوں مسلم قوم پرستوں کی ملی غیرت کو للکارنے کے مترادف تھا۔ اگر ایوب خاں کے نمک خوار بار بار اعلانِ تاشقند کی حمایت میں بیانات دے کر اور مقالے لکھ کر قوم کے زخموں پر نمک پاشی نہ کرتے تو شاید مجھ جیسے جوشیلے نوجوانوں کے جذبات وقت گزرنے کے ساتھ سرد پڑ جاتے مگر قدرت کو بہرحال یہ منظور تھا کہ ہماری ملی تاریخ ایک نئی کروٹ لے۔

اعلانِ تاشقند کی حمایت میں ایک بیان دے کر بھٹو خاموش ہو گیا تھا اور

اس کی خاموشی واضح طور پر اس امر کا اعلان تھی کہ وہ بیان اس نے ایوبی آمریت کے زبردست دباؤ کے تحت دے تو دیا تھا، لیکن اس کا دل قوم کے ساتھ تھا۔ جو تڑپ عوام کے دلوں میں تھی وہ تڑپ بھٹو کے دل میں بھی تھی۔ اس تڑپ کی عظمت کی خاطر میں نے وقتی بزدلی کے اس مظاہرے کو فراموش کر دیا جو بھٹو نے اعلانِ تاشقند کے حق میں بیان دے کر کیا تھا۔ اور مجھ جیسے جذبات رکھنے والے لاکھوں عوام بھی بھول گئے کہ بھٹو نے ایسا کوئی بیان دیا تھا۔

آہستہ آہستہ باخبر حلقوں میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ بھٹو حکومت سے الگ ہو رہا ہے۔ ان ہی دنوں نواب آف کالا باغ کے ساتھ بھی ایوب خاں کے اختلافات پیدا ہو چکے تھے اور ایوبی آمریت کا یہ طاقتور ستون بھی اپنی جگہ سے ہٹنے والا تھا۔ وہ واحد شخص جو ایوب خان پر بھٹو کے ہر وار کو ڈھال بن کر روکنے کی قوت اور صلاحیت رکھتا تھا اس نے بھی حکومت سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے ایوب خان کی بدقسمتی ہی قرار دیا جا سکتا ہے کہ انہیں یہ احساس نہ ہو سکا کہ بھٹو ان کے لئے کتنا بڑا چیلنج بننے والا ہے اور اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے انہیں نواب آف کالاباغ جیسی آہنی شخصیت رکھنے والے رفیق کی کتنی ضرورت ہے۔

بہرحال تاریخ کا فیصلہ پوری قوت کے ساتھ نافذ ہونے والا تھا اور اس فیصلے کو بدلنا ایوب خاں کے بس کی بات نہیں تھی۔

---

# تین عظیم جھوٹ

بھٹو کا منہ بند تھا۔ لیکن
آنکھیں بول رہی تھیں
اور ان آنکھوں میں آنسو
تھے۔ اپنی بے پناہ اداکارانہ
صلاحیتوں کی بدولت اس
نے خاموش رہ کر وہ سب کچھ
حاصل کر لیا جو اسے بے شمار
دھواں دار اور جوشیلی
تقریروں سے بھی حاصل
نہ ہوتا۔

وہ دن بالآخر آن پہنچا جب پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بھٹو آخری سفر کرنے والا تھا۔ یہ خبر آچکی تھی کہ بھٹو کو سبکدوش کر دیا گیا ہے اور سبکدوشی سے پہلے وہ آرام کے لئے ملک سے باہر رخصت پر چلا جائے گا۔ یہ سبکدوشی ایک سمجھوتے کے تحت عمل میں آئی تھی۔ اس سمجھوتے کے مطابق بھٹو کو خاموشی اختیار کرنا تھی کوئی ایسا تبصرہ نہیں کرنا تھا جس سے حکومت کا وقار مجروح ہو سکتا ہو اور کسی ایسی سرگرمی میں حصہ نہیں لینا تھا جس سے حکومت کے مفادات کو زک پہنچنے کا احتمال ہو۔ ان پابندیوں کو قبول کرنے کی صورت میں بھٹو کو یہ ضمانت دی گئی تھی کہ ایوانِ اقتدار سے اسے باعزت طور پر رخصت کیا جائے گا اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

جن عزائم کی تکمیل کے لئے بھٹو نے وزارت کا قلمدان ٹھکرایا تھا ان کا تقاضہ ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ اس سمجھوتے پر عمل کرے مگر عارضی طور پر خاموش رہ کر منصوبہ بندی کرنے اور اپنے ارد گرد عوامی طاقت کے حصار قائم کرنے میں کوئی ہرج نہیں تھا اور پھر خاموش رہ کر بھی وہ سب کچھ کہہ جانے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔

اس خدا داد صلاحیت کا اظہار بھٹو نے اس روز بڑے ہی بھرپور انداز میں کیا جب سبکدوشی کے سمجھوتے کے بعد وہ اسلام آباد سے بذریعہ ریل لاہور پہنچا۔

بھٹو نے ریل سے سفر کرنے کا پروگرام بغیر مقصد کے نہیں بنایا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایوب خاں کی سیاسی بصیرت انہیں یہ بھی نہ بتا سکی کہ بھٹو نے فضائی سفر پر ریل کے سفر کو کیوں ترجیح دی ہے۔

وہ دوپہر آج بھی میرے ذہن میں نقش ہے جب اہل لاہور اپنی قومی امنگوں کے "بے باک نقیب" کو خراج عقیدت پیش کرنے اور اس کا فقیدالمثال استقبال کرنے کے لیے ریلوے سٹیشن پر قابض ہو چکے تھے۔ اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آ رہا تھا۔ قومی امنگوں کی سربلندی کی خاطر وزارت خارجہ کا عظیم منصب ٹھکرانے والے بھٹو کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پورا شہر سٹیشن پر امڈ آیا تھا۔ بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے کا عزم رکھنے والے بھٹو کے ساتھ اپنی جذباتی فکری اور عملی وابستگی کا بھرپور اظہار کرنے کے لیے میں بھی سٹیشن پر موجود تھا۔ میرے ساتھ فوٹو گرافر کے علاوہ روزنامہ کوہستان کے میگزین ایڈیٹر خالد محمود بھی تھے۔

جب ٹرین آ کر رکی تو پورا سٹیشن بھٹو کی حمایت اور ایوب خان کی مخالفت میں بلند ہونے والے نعروں سے گونج اٹھا۔ لوگ پروانہ وار اس بوگی کی طرف دوڑے جس میں بھٹو سفر کر رہا تھا۔ اتفاق سے میں خالد محمود اور فوٹو گرافر کے ساتھ جس جگہ کھڑا تھا بھٹو کی بوگی اس کے بالکل سامنے آ کر رکی۔ بھٹو جس کمپارٹمنٹ میں تھا اس کا دروازہ فوراً ہی کھلا اور وہ چہرہ لاکھوں آنکھوں کے سامنے آگیا جس پر بے بسی کا غلاف بھی چڑھا ہوا تھا اور جس سے عزم کی روشنی بھی پھوٹ رہی تھی۔ بھٹو کا منہ بند تھا لیکن آنکھیں بول رہی تھیں۔ کپکپاتے ہونٹ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر کہہ نہیں سکتے تھے۔ لرزتی ہوئی پلکوں کے سائے میں آنسوؤں کا طوفان امڈ رہا تھا، لیکن اس طوفان کو آنکھوں کی قید سے باہر نہیں لایا جا سکتا

تھا۔ بھٹو ایوب خاں سے کئے جانے والے سمجھوتہ پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ مگر کچھ نہ کہنے کے باوجود وہ سب کچھ اتنے تاثر انگیز انداز میں کہہ رہا تھا کہ ان چند لمحات کے دوران وہ اپنے مداحوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر گیا۔

یہ بھٹو کی تیسری بڑی پرفارمنس تھی۔ اپنی بے پناہ اداکارانہ صلاحیتوں سے کام لے کر اس نے خاموش رہ کر وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو اسے بے شمار جوشیلی اور دھواں دھار تقریروں سے بھی حاصل نہ ہوتا۔ اتنی عظیم پرفارمنس شاید دلیپ کمار بھی نہ دے سکتا۔ میں نے اور لاہور کے دوسرے ہزاروں لاکھوں شہریوں نے اس شاندار پرفارمنس کا تاثر اندھی عقیدت کے ساتھ قبول کرتے وقت یہ نہ سوچا کہ حضرت موسیٰؑ کا کردار ادا کر کے چارلٹن ہیسٹن سچ مچ حضرت موسیٰؑ نہیں بن گیا تھا

بھٹو کے شیدائی اس کے کمپارٹمنٹ میں گھس گئے تھے۔ ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ بھٹو کی قمیض کے بٹن ٹوٹ گئے تھے اور وہ عقیدت کے اس زبردست مظاہرے سے مغلوب ہو کر وہاں دروازے میں بیٹھ گیا۔ ہمارا فوٹوگرافر ان تاریخی لمحات کو بڑی تیزی اور مہارت کے ساتھ اپنے کیمرے میں محفوظ کرتا جا رہا تھا۔

سٹیشن سے دفتر جاتے وقت میں اپنی چشم تصور سے بھٹو کی قیادت میں ایوبی آمریت کے خلاف ایک عظیم الشان قومی تحریک کو شروع ہوتے۔ پروان چڑھتے اور منزلِ کامرانی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

لاہور میں بھٹو کا قیام بڑا مختصر تھا۔ سٹیشن سے اسے گورنر ہاؤس لے جایا گیا جہاں نواب آف کالا باغ نے اس کے اعزاز میں ایک نجی ضیافت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ دو پرانے سیاسی حریفوں میں سے ایک مہمان بن کر آیا تھا اور دوسرا میزبان بنا ہوا تھا۔ ایک ایوب خان کو الوداع کہہ چکا تھا اور دوسرا الوداع کہنے والا تھا۔ مجھے ابنِ خلدون کی یہ بات بڑی شدت کے ساتھ یاد آئی کہ جب واقعات

کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملنے لگتی ہیں تو جو سلسلہ جنم لیتا ہے اسے تاریخ کہتے ہیں۔

وزارتِ اطلاعات کی طرف سے اخبارات کو سختی سے یہ ہدایات کی گئی تھیں کہ لاہور میں بھٹو کے استقبال کی خبر کو بالکل غیر نمایاں انداز میں شائع کیا جائے۔ مگر میرا دل، میرا ذہن اور میرا ضمیر اس ہدایت پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اگلے روز کوہستان کے صفحہ اول پر یہ خبر دو کالمی ہونے کے باوجود خاصی نمایاں نظر آ رہی تھی خبر کے ساتھ ایک انتہائی تاثر انگیز تصویر بھی تھی۔ جس کے نیچے لکھی جانے والی عبارت مجھے آج بھی یاد ہے۔

"ایوانِ حکومت سے عوام کی آغوش تک ——— بھٹو کا سفر"

○ ○

ایوانِ حکومت سے نکلنے کے بعد بھٹو کا سفر آسان نہیں تھا۔ عوامی حمایت موجود تھی لیکن ایوبی آمریت کی تنی ہوئی سنگینیں بھی موجود تھیں۔ راستہ دشوار گزار اور کانٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان کانٹوں پر چلنے کے لئے سخت گوریلا کے حوصلے کی ضرورت تھی اور بھٹو سخت گوریلا نہیں تھا۔ اس کی پرورش ایر کنڈیشنڈ کمروں میں ہوئی تھی اس کا مزاج ایک رئیس زادے کا مزاج تھا اس کی عادات ایک وڈیرے کی عادات تھیں۔ اس کی خواہشات ایک شہزادے کی خواہشات تھیں اور راستہ اس نے ایسا منتخب کیا تھا جس پر چلنا کسی رئیس زادے، کسی وڈیرے اور کسی شہزادے کے بس کی بات نہیں تھی لیکن اقتدار کی جس منزل پر بھٹو کی نظریں جمی ہوئی تھیں اس طرف اس راستے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں جاتا تھا وہ اس راستے پر چلنے کے لئے مجبور تھا۔ البتہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے سے وہ کئی کانٹوں سے اپنا دامن بچا سکتا تھا اور یوں اپنے سفر

کو نسبتاً کم تکلیف دہ بنا سکتا تھا۔

اور بھٹو نے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا۔ حکومت کے اندر اس نے اپنے حامیوں مداحوں اور دوستوں کا جو حلقہ بنایا تھا وہ اب بھی موجود تھا۔ فوج کے کئی جنرل اور مختلف عہدوں پر فائز کئی اعلیٰ سول افسر بھی اس حلقے میں شامل تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ایوبی آمریت کا بت آہستہ آہستہ اندر سے کھوکھلا ہو رہا ہے۔ فی الحال اس بت میں کافی جان تھی۔ اس لئے فوری طور پر اس بت کو پاش پاش کرنے کی کوشش کرنا خود اپنی تباہی کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن مناسب وقت آنے پر اچانک ایسا بھرپور وار کیا جا سکتا تھا کہ ایوبی آمریت کو سنبھلنے اور اپنا دفاع کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ وقت بھٹو کے ساتھ تھا۔

اعلانِ تاشقند کے خلاف طلبا نے جو مظاہرے کئے وہ بھٹو کے حوصلے بلند رکھنے اور اس کے عزائم کو ایندھن فراہم کرنے کے لئے کافی تھے۔ لیکن صحیح معنوں میں ایک قومی لیڈر کا مقام حاصل کرنے اور ایوبی آمریت کے لئے ایک حقیقی چیلنج بننے کے لئے بھٹو کو ایک پلیٹ فارم کی ضرورت تھی ایک ایسا سیاسی پلیٹ فارم جس پر وہ اپنی قوت کے تمام ذرائع اور وسائل جمع کر سکے۔ ایسے طاقتور سیاسی پلیٹ فارم کے بغیر کھل ایوبی آمریت سے ٹکر نہیں لی جا سکتی تھی۔ اعلانِ تاشقند کے خلاف ہونے والے مظاہروں کے دوران بھی بھٹو نے کھل کر سامنے آنے اور ایوبی آمریت کو للکارنے سے بہتر سمجھا کہ پسِ پردہ رہ کر مطلوبہ سیاسی پلیٹ فارم کا ڈھانچہ تیار کیا جائے۔

بھٹو نے دنیا بھر میں چلنے والی مختلف تحریکوں کا پوری تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس نے لینن کے فلسفۂ انقلاب کے بارے میں بھی پڑھا اور مسولینی کے فاشزم کے بارے میں بھی۔ اس نے ہٹلر کی نازی پارٹی کے متعلق بھی اپنے مطالعے

میں وسعت پیدا کی اور ماؤ زے تنگ کی انقلابی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا۔ بیسویں صدی کی ان چار اہم ترین تحریکوں کے پیچھے نظریات کی جو قوت تھی اس سے بھٹو کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کسی مقصد یا نظریہ کی فتح مندی کے لئے میدانِ سیاست میں نہیں آیا تھا۔ اسے اقتدار کی اعلیٰ ترین منزل تک پہنچنا تھا اور اپنے اس مشن کی تکمیل کے لئے وہ ہر قیمت پر اور ہر طریقے سے عوام کو اپنے پیچھے لگانا چاہتا تھا دنیا کی مختلف تحریکوں کے مطالعے سے وہ ایسے طریقے دریافت کرنا چاہتا تھا جنہیں اختیار کر کے وہ عوام کے اکثریتی طبقوں کے جذبات پر حکومت کر سکے۔ سب سے زیادہ متاثر وہ ہٹلر کی نازی تحریک سے ہوا۔ لیکن یہاں میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بھٹو کی شخصیت کا موازنہ ہٹلر کی شخصیت سے کرنا جذبۂ حب الوطنی کی توہین ہے۔ جرمنی اور جرمن قومیت سے محبت ہٹلر کے خون میں رچی بسی تھی یہ محبت جنون کی حد تک پہنچی تو ہٹلر نے دنیا سے جرمنی کی عظمت اور جرمن قوم کی برتری منوانے کے لئے ایسے لوگوں کے خلاف سنگین ترین جرائم کا ارتکاب کرنے سے بھی گریز نہ کیا جنہیں وہ جرمنی اور جرمن قوم کے دشمنوں میں شمار کرتا تھا اگر ہٹلر مجرم تھا تو اسے مجرم اس بے پایاں محبت نے بنایا جو اسے جرمنی اور جرمن قومیت سے تھی ہٹلر نے نیشنل سوشلسٹ پارٹی اقتدار کی منزل تک پہنچنے کے ضرور قائم کی مگر وہ اقتدار اس لئے حاصل کرنا چاہتا تھا کہ جرمنی کی سرحدوں کو وسعت دے سکے اور جرمن قوم کی برتری دنیا پر ثابت کر سکے۔ ہٹلر کے جرائم سے نفرت کی جا سکتی ہے لیکن حب الوطنی کے اس عظیم جذبے سے نفرت کون کر سکتا ہے جس نے ہٹلر کو مجرم بنایا تھا؟ ہٹلر کے ساتھ اس بھٹو کا موازنہ کیسے کیا جا سکتا ہے جس نے اپنی ہوسِ اقتدار کی تکمیل کے لئے اپنے وطن کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور اپنی قوم پر ذلت و رسوائی کے دروازے کھولنے سے بھی دریغ نہ کیا؟

بھٹو کو نازی تحریک نے صرف ان ہتھکنڈوں کی وجہ سے متاثر کیا جو ہٹلر نے نیشنل سوشلسٹ پارٹی کی قوت میں اضافہ کرنے کے لئے اختیار کئے تھے۔ ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے جو جھوٹ بولے تھے وہ بھٹو کو بہت پسند آئے مگر اس مقصد سے بھٹو کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جس کے حصول کے لئے نیشنل سوشلسٹ پارٹی قائم ہوئی تھی اور وہ سب جھوٹ بولے گئے تھے۔ بھٹو کا مقصد صرف اور صرف حصولِ اقتدار تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ ہر جھوٹ بولنے ہر سوانگ رچانے اور ہر بہروپ اختیار کرنے کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ اس نے تین بہترین جھوٹ، تین بہترین سوانگ اور تین بہترین بہروپ منتخب کئے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کر دی۔

اسلام: یہ ایک ایسا جھوٹ، ایک ایسا سوانگ اور ایک ایسا بہروپ تھا جسے بھٹو اپنے دین سے والہانہ عقیدت رکھنے والے عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

سوشلزم: یہ ایک ایسا جھوٹ، ایک ایسا سوانگ اور ایک ایسا بہروپ تھا جسے بھٹو غربت اور افلاس کے مارے ہوئے عوام کے جذبات سے کھیلنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

جمہوریت: یہ ایک ایسا جھوٹ، ایک ایسا سوانگ اور ایک ایسا بہروپ تھا جسے بھٹو بنیادی حقوق کی تمنا کرنے والے باشعور طبقوں کی حمایت حاصل کرنے اور انتخابات کے ذریعے منزلِ اقتدار تک پہنچنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

المیہ یہ ہے کہ میں نے اور مجھ جیسے لاکھوں قوم پرستوں نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا کہ بھٹو واقعی اسلام کی وہ صدا ہے جو مسلم قوم کی سربلندی کے لئے پاک فضاؤں میں گونجی ہے۔ کہ بھٹو واقعی انقلاب کا وہ پیغام ہے جو سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ

نظام کی چکی میں پسنے والے کروڑوں غریب عوام کو محرومی اور بے بسی کی قید سے نجات دلانے آیا ہے۔ کہ بھٹو واقعی جمہوریت کی وہ مشعل ہے جس کی روشنی میں ملت پاک آگے بڑھ کر حاکمیت کا حق فرد واحد سے چھین لے گی۔

میرے اور میرے لاکھوں ہم وطنوں کے اس یقین نے بھٹو کو پاکستان پیپلز پارٹی کی صورت میں وہ طاقتور سیاسی پلیٹ فارم مہیا کر دیا جو ایوبی آمریت کو للکارنے کے لئے ضروری تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام اور اس کی تشکیل میں جن لوگوں نے بھٹو کا ساتھ دیا ان میں جے اے رحیم کا نام سرفہرست ہے۔ ایک روایت کے مطابق مسٹر جے اے رحیم نے ہی بھٹو کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی سیاسی قوت کے لئے صرف ان جذبات پر ہی انحصار نہ کرے جو اردو اور پنجابی بولنے والے مسلم قوم پرستوں کے دلوں میں توسیع پسند برہمنی سامراج کے خلاف وقتاً فوقتاً ابھرتے رہتے ہیں کیوں کہ اس قسم کے جذبات رکھنے والا طبقہ صرف مظاہرے کرنے جلوس نکالنے اور نعرے لگانے کی حد تک بھٹو کے کام آسکتا تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ عوام کی اُس واضح اکثریت کو بھی اپنے جھنڈے تلے جمع کیا جاتے جسے بھارت کو نیچا دکھانے سے زیادہ دلچسپی اس روٹی سے تھی جو اسے نہیں ملتی تھی۔ اُس کپڑے سے تھی جو اسے حاصل نہیں ہوتا تھا اور اُس مکان سے تھی جو اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ جے اے رحیم کی رائے میں "روٹی کپڑا اور مکان" کے چکر میں پھنسے ہوتے عوام کے اس طبقے کے مسائل کی بات ابھی تک کسی لیڈر اور کسی پارٹی نے نہیں کی تھی، اس لئے پیپلز پارٹی آگے بڑھ کر اس خلاء کو پُر کر سکتی تھی۔

بھٹو نے اس رائے کو فوراً قبول کر لیا۔ اسلام کا نعرہ تو دوسرے لیڈر بھی استعمال کر رہے تھے۔ جمہوریت کی جدوجہد میں تو دوسری پارٹیاں بھی شامل تھیں ملکی سالمیت

اور قومی یک جہتی کی باتیں کرنے والے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ پیپلز پارٹی کو منفرد حیثیت صرف اس طرح دی جا سکتی تھی کہ وہ اسلام جمہوریت ملکی سالمیت اور قومی یک جہتی کے گھسے پٹے نعرے بلند کرنے کے ساتھ ساتھ غریب عوام کے مسائل حل کرنے اور انہیں روٹی کپڑا مکان مہیا کرنے والے اس نظام کی بھی بات کرے جس کا نام سوشلزم تھا۔

چنانچہ نوزائیدہ پیپلز پارٹی کو تین حسین نعروں سے سجایا گیا۔

۱۔ اسلام ہمارا دین ہے۔

۲۔ جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

۳۔ سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

یہ کتنے بڑے جھوٹ تھے۔ اسلام اس بھٹو کا دین بن گیا تھا جو علی شراب کے بغیر جاگ نہیں سکتا تھا اور نئی عورت کے بغیر سو نہیں سکتا تھا۔ جمہوریت اس بھٹو کی سیاست بن گئی تھی جس کے سیاسی مزاج کی تشکیل ایوبی آمریت نے کی تھی اور جو اپنی رائے سے اختلاف کرنے والوں کو زندہ دفن کروا دینے والا ضمیر رکھتا تھا اور سوشلزم کو اس بھٹو نے اپنی معیشت بنالیا تھا جو کسانوں کی ہڈیوں پر دولت و حشمت، شان و شوکت اور جاہ و جلال کے محل تعمیر کرنے والے نظام کا وارث تھا یہ تین عظیم جھوٹ پیپلز پارٹی کی بنیاد بن گئے۔

جب ظلمتیں حد سے بڑھ جاتی ہیں تو انسان کو روشنی کی جو بھی کرن نظر آتی ہے اس کی طرف بھاگتا ہے۔ ایوبی آمریت کے اندھیرے بھی حد سے بڑھ گئے تھے اور ان اندھیروں میں بھٹو میرے اور میرے لاکھوں ہم وطنوں کے لئے روشنی کی کرن بن گیا تھا۔ ہم سب دیوانہ وار اس کی طرف بھاگ رہے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ جس کے پیچھے ہم بھاگ رہے ہیں وہ سراب بھی ہو سکتا ہے۔

پیپلز پارٹی کے قیام کے باقاعدہ اعلان سے پہلے بھٹو نے کچھ عرصہ یورپ میں گزارا۔ روم میں اس نے سی آئی اے کے نمائندوں کے ساتھ تفصیلی مذاکرات کیئے اور انہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ اس نے سی آئی اے پر واضح کر دیا کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ سوشلزم کا دم چھلا اس نے بائیں بازو کو دھوکہ دینے کے لئے لگایا تھا۔ اس کا مقصد بائیں بازو کو پیپلز پارٹی میں ضم کر کے معاشی اور معاشرتی انقلاب کا خواب دیکھنے والے مغرب دشمن عناصر کو کسی بھی ایسی تحریک کے جھنڈے تلے جمع ہونے سے روکنا تھا جو درحقیقت بائیں بازو کی تحریک ہو۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنے آپ کو "مغربی سامراج کا زبردست دشمن" اور "چینی انقلاب کا پرجوش حامی" ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

سی آئی اے کو بھٹو کی اس حکمت عملی سے بھلا کیا اختلاف ہو سکتا تھا، پاکستانی عوام میں چین کی حمایت اور امریکہ کی مخالفت کے جذبات کافی زور پکڑ چکے تھے اور ایوب خاں کے خلاف کوئی ایسی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی تھی جو عوامی جذبات کے ساتھ نہ چلے۔ بھٹو بھی عوامی جذبات کے ساتھ چل کر ہی کامیاب ہو سکتا تھا۔ اور بھٹو کی کامیابی سے امریکہ کے چند اہم مقاصد پورے ہوتے تھے۔ ایک تو ایوب خاں سے نجات حاصل ہوتی تھی اور اس کے علاوہ امریکہ کے خلاف عوامی جذبات کی قیادت امریکہ کے ہی آدمی کے ہاتھ میں رہتی تھی۔

چنانچہ سی آئی اے نے بھٹو کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی پیپلز پارٹی کو ایوب خان کے خلاف میدان میں اتار دے۔ بھٹو کو اجازت سے زیادہ سرمائے کی ضرورت تھی کیونکہ مختصر عرصے میں ایک طاقتور سیاسی پارٹی کی تشکیل اور تعمیر فراخدلانہ مالی امداد کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ سی آئی اے نے بھٹو سے وعدہ کر لیا کہ اسے مالی امداد اس کی توقع سے بھی بڑے پیمانے پر دی جائے گی۔ بھٹو یکمشت پانچ کروڑ

روپے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ بات سی آئی اے کی پالیسی کے خلاف تھی۔ پھر بھی پہلی قسط کے طور پر بھٹو سی آئی اے سے کافی بڑی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور پاکستان پہنچ کر اس نے پیپلز پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیا۔

ایوب خان کو بھی اب پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ ان کے سابق وزیر خارجہ کی پُر اسرار سرگرمیوں کے پیچھے کوئی بڑی سازش جنم لے رہی ہے۔ چنانچہ انتظامیہ کو ہدایت کر دی گئی کہ بھٹو کی نقل و حرکت کی سخت نگرانی کی جائے اور اسے ڈرانے دھمکانے اور پریشان کرنے کے لئے ہر موثر حربہ استعمال کیا جائے وزارت اطلاعات کے ذریعے اخبارات کو بھی ہدایات دے دی گئیں کہ بھٹو اور اس کی پارٹی کی خبروں کو مکمل طور پر "بلیک آؤٹ" کا نشانہ بنایا جائے۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایسے اقدامات کئے گئے جن کا مقصد بھٹو کو ہراساں کرنا، لوگوں کو اس کی قائم کردہ پارٹی میں شامل ہونے سے روکنا تھا۔

لیکن اب بھٹو کے خلاف بند باندھنے کا وقت گزر چکا تھا۔ بھٹو کی سیاسی بنیادیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں اور انہیں زیادہ مضبوط بنانے کے لئے وہ درپردہ طلباء کی تنظیموں، طالب علم لیڈروں، لیبر یونینوں اور مزدور رہنماؤں کے ساتھ "طاقتور" روابط قائم کر رہا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ طالب علم لیڈروں اور مزدور رہنماؤں کو "پیسے" کی کتنی اشد ضرورت رہتی ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اب بھٹو کے پاس بے حساب پیسہ آ گیا تھا۔ وہ اپنے "خون" اور "پسینے" کی کمائی صرف اپنی ذات پر خرچ کرنے کا قائل تھا۔ مگر اب اس کے پاس امریکہ کے "خون" اور "پسینے" کی کمائی بھی آ گئی تھی۔ جسے وہ بڑی فیاضی کے ساتھ "انقلاب" اور "جدوجہد" وغیرہ پر خرچ کر سکتا تھا۔

حسب توقع سوشلزم کا نعرہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ان پُرخلوص

"انقلاب پرستوں" کو بھی پیپلز پارٹی کی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوگیا جو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے "پرولتاری آمریت۔ بورژوا ذہنیت۔ انقلابی جدوجہد۔ طبقاتی کشمکش۔ ترقی پسند نظریات اور رجعت پسند معاشرہ" جیسی پُرکشش جدید اور انفرادیت بخش اصطلاحوں کے اسیر بن کر نکلے تھے۔ میرا اشارہ یہاں معراج محمد خاں تاج محمد لنگاہ، سعید حسن اور مختار رانا جیسے لوگوں کی طرف ہے۔ جن کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ جس شخص کی زیر قیادت امریکی سامراج کے "پالتو کتوں" کے خلاف انقلابی جدوجہد کرنے کے لئے نکلے ہیں وہ خود امریکی سامراج کا "منظورِ نظر" ہے

جہاں تک ان جغادری قسم کے "ترقی پسندوں" کا تعلق ہے جن کی ترقی ماسکو کی سرپرستی، شفقت اور نوازشوں کی محتاج تھی۔ ان کے لئے پیپلز پارٹی "لمحہ فکریہ" بن کر نازل ہوئی تھی۔ ابتداء میں اس قبیلے کے ترقی پسندوں نے یہ واویلا ضرور کیا کہ "پیپلز پارٹی کی ترقی پسندی" جعلی ہے اور "اصلی ترقی پسندی کے سول ڈیلر اور ڈسٹری بیوٹر" ہم ہیں۔ لیکن جلد ہی انہیں احساس ہوگیا کہ "نقلی مال" اپنے خوب صورت لیبل کی وجہ سے مارکیٹ پر تیزی سے چھا رہا ہے۔ اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ وہ اپنے مال کے "اصلی پن" پر اترانے کی بجائے نقلی مال فروخت کرنے والوں کے ساتھ تجارتی سمجھوتہ کریں۔

بھٹو کی سٹرائکنگ پاور میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا مگر وہ ایوب خان پر حملہ آور ہونے سے پہلے پوری طرح یہ اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ بوڑھے آمر کی قوتِ مدافعت جواب دے چکی ہے۔ ابھی تک اسے یہ اطمینان حاصل نہیں ہوا تھا کیونکہ جن ہاتھوں سے ایوب خان نے سانپ کو مارنے والی لاٹھی پکڑ رکھی تھی ان ہاتھوں میں ابھی تک رعشہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ فی الحال اس لاٹھی کی زد میں آنے سے بچے رہنا ہی بہتر تھا۔ افسر شاہی اور فوج میں اس کے جو ایجنٹ دوست اور ہمنوا تھے ان کی طرف سے

بھٹو کو مفید معلومات، مشورے اور ہدایات باقاعدگی کے ساتھ مل رہی تھیں اور وہ کوئی بھی فیصلہ کن قدم ان معلومات، مشوروں اور ہدایات کی روشنی میں اٹھانا چاہتا تھا۔ بھٹو کے کسی بھی اقدام کی کامیابی کا انحصار دو باتوں پر تھا۔

۱۔ عوام کی بڑی اکثریت میں بلا خوف وخطر ایوب خاں کے خلاف اور بھٹو کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آئیں۔

۲۔ فوج کے اندر بھٹو کے حامیوں کی پوزیشن اتنی مضبوط ہو کہ وہ "امن عامہ کی بگڑتی ہوئی صورت حال" کو بہانہ بنا کر اپنے فیلڈ مارشل کو گدی سے اتار سکیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، بھٹو کے پاس عوام کو ایوب خاں کے خلاف مشتعل کرنے اور انہیں اپنی حمایت میں سڑکوں پر لانے کا "جذباتی وعملی گولہ بارود" موجود تھا۔ اس کے پاس بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ کرنے کا نعرہ تھا اس کے پاس اعلانِ تاشقند کا بھوت تھا جسے وہ حسب منشا اور حسب ضرورت کھلا چھوڑ سکتا تھا۔ اس کے پاس غریب عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرنے کا سٹنٹ تھا جو پہلی بار پاکستان کے پردۂ سیاست پر پیش کیا جا رہا تھا۔ اس کے پاس وہ یقین دہانیاں تھیں جو مزدور لیڈروں نے کرائی تھیں اور جنہیں وہ صنعتی امن کو برباد کرنے کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے پاس وہ وفاداریاں تھیں جن کے سودے کرنے والے طالب علم رہنما طلبا کو کلاسوں سے نکال کر جلوسوں میں شامل کرنے کی پوری قوت رکھتے تھے اور اس کے پاس وہ پیسہ بھی تھا جو امرت دھارا کی طرح ہر مرض کا فوری علاج ہوتا ہے۔

یہ سب کچھ بھٹو کے پاس تھا، لیکن فوج پر ایوب خاں کی گرفت اب بھی اتنی مضبوط تھی کہ بھٹو کے حامی جنرل اس کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کی ہمت پیدا نہیں کر پا رہے تھے۔

# سازشوں کا جال

مجرم دو قسم کے ہوتے ہیں
ایک وہ جنہیں حالات کسی
جرم کی طرف دھکیلتے ہیں
شیخ مجیب الرحمٰن کا تعلق
مجرموں کی اسی قسم سے تھا
دوسری قسم کے مجرم وہ ہوتے
ہیں جو مجرمانہ فطرت اور
مجرمانہ ضمیر لے کر پیدا ہوتے
ہیں اور جو حالات کو اپنے
مجرمانہ مقاصد کے مطابق ڈھال
لیا کرتے ہیں۔ پاکستان کی
تقدیر ایسے ہی مجرم کے ساتھ
وابستہ ہونے والی تھی۔

۱۹۶۷ء کے اواخر میں بظاہر یوں لگتا تھا جیسے بھٹو قصہ ماضی بن چکا ہو اور سیاسی افق پر اس کے ظہور کے امکانات معدوم ہو گئے ہوں۔ یہی وہ ایام تھے جب بھٹو خاموشی کے ساتھ ایوبی آمریت کے خلاف "عوامی امنگوں" کی ناگزیر جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ ایوب خاں ان تیاریوں سے بے خبر نہیں تھے۔ اسی لئے پریس ریڈیو اور ٹیلیویژن سے بھٹو کا نام مکمل طور پر غائب کر دیا گیا تھا۔ ایوب خاں اور ان کے مشیروں کی حکمت عملی یہ تھی کہ لوگ بھٹو کا نام بھول جائیں۔ دفعہ ۱۴۴ اور اس قسم کے دوسرے کئی قوانین اس امر کی ضمانت دینے کے لئے موجود تھے کہ بھٹو کو عوام سے براہ راست رابطے کا موقع نہ مل سکے۔ خود بھٹو بھی ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا کیوں کہ اس نے "انتظار کرنے" کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ کبھی کبھی وہ بیانات ضرور دیا کرتا تھا لیکن ان بیانات کا علم عوام کو بہت ہی کم ہو پاتا تھا کیونکہ ابلاغ کے تمام ذرائع تقریباً مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں تھے۔ اگر بھٹو کے کچھ خیالات عوام تک پہنچتے تھے تو ان تردیدی بیانات اور تقریروں کے ذریعے پہنچتے تھے جو سرکار کے نمک خوار بھٹو کو جھٹلانے کے لئے جاری کیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں عوامی رابطے کی اس مہم کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو جنرل موسیٰ نے نومبر ۱۹۶۷ء کے آخری ہفتے میں شروع کی اور تقریباً پندرہ روز تک جاری رکھی۔ اس مہم کا مقصد حکومت پر بھٹو کے الزامات کی تردید کرنا

اور عوام کو بھٹو کے خطرناک عزائم سے آگاہ کرنا تھا۔ اسی مہم کے دوران بھٹو کو بھول جانے والے لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ اب بھی میدانِ سیاست میں موجود ہے نہ صرف موجود ہے بلکہ حکومت پر ایسے الزامات بھی لگا رہا ہے۔ جن کی تردید کرنے کے لئے صوبے کا گورنر خود عوامی رابطہ کی مہم پر نکلا ہے۔ میں اس زمانے میں روزنامہ مشرق کراچی کا ایڈیٹر تھا اور مجھے یاد ہے کہ ڈائریکٹر اطلاعات و تعلقات عامہ سے مجھے ہر روز یہی "ہدایت" ملتی تھی کہ آج گورنر صاحب نے فلاں جگہ جو تقریر کی ہے اسے نمایاں طور پر شائع کیا جائے۔ ایک دو روز تو میں نے پریس ٹرسٹ کے ایک اخبار کا ایڈیٹر ہونے کی مجبوری کے پیش نظر اس "ہدایت" پر عمل کیا، لیکن روز روز ایک ہی شخص کی ایک ہی قسم کی تقریر کو "نمایاں" طور پر شائع کرنا اخبار کے قارئین کے ساتھ ظلم تھا۔ چنانچہ گورنر موسیٰ کی تیسری تقریر کو اخبار میں، میں نے وہی پوزیشن دی جو اسے اصولی طور پر ملنی چاہیئے تھی۔ اگلے دن ڈائریکٹر اطلاعات و تعلقات عامہ نے مجھ سے "ہدایت کی خلاف ورزی" کی شکایت کی تو میں نے کہا "یقین کیجیئے قارئین کو گورنر صاحب کی تقریر حفظ ہو چکی ہے اور اب وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر وہ پُر اسرار بیان کہاں ہے۔ جس کی تردید کے لئے گورنر صاحب روز روز یہ تقریر فرما رہے ہیں۔"

"اس بیان کی اشاعت ملکی مفاد کے خلاف ہے۔" ڈائریکٹر نے جواب دیا۔

"تو پھر اس کی تردید آپ روز روز اس قدر نمایاں طور پر کیوں شائع کروا رہے ہیں؟ اس طرح تو قارئین کے ذہن میں ملکی مفاد کے خلاف اس بیان کے بارے میں خواہ مخواہ تجسس پیدا ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

ظاہر ہے کہ ڈائریکٹر مذکور کے پاس میری اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا پریس پر پابندی کا فوری فائدہ تو حکومت کو پہنچتا ہے مگر اس کے دور رس نتائج اس کے لئے عموماً تباہ کن ہوتے ہیں۔ کیونکہ پابندیوں میں جکڑا ہوا پریس تصویر کا صرف

ایک رخ پیش کرتا ہے اور قارئین کے ذہنوں میں تصویر کے اس دوسرے رخ کے بارے میں تجسس بڑھتا رہتا ہے۔ جسے ان کی نظروں سے دور رکھنے کی بھونڈی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ تجسس آہستہ آہستہ اسی طوفان کا پیش خیمہ بن جاتا ہے جسے روکنے کے لئے پریس پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔

ایوب خان نے نیشنل پریس ٹرسٹ قائم ہی اس مقصد کے لئے کیا تھا کہ اخبارات کی اکثریت براہ راست سرکاری کنٹرول میں رہے۔ یہاں میں عزیز احمد کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس زمانے میں نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین تھے اور جنہیں چند برس بعد بھٹو کے دستِ راست کے فرائض انجام دینے تھے۔

عزیز احمد سے براہِ راست میرا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ میں صرف یہ جانتا تھا کہ وہ امریکی لابی کے آدمی ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں ایوب خان کا اعتماد حاصل ہے ایک روز کی بات ہے نواب شاہ سے ایک شخص آکر مجھے ملا اور کہنے لگا کہ اسے پریس ٹرسٹ کے چیئرمین نے بھیجا ہے۔ میں نے آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ نواب شاہ میں مشرق کا نامہ نگار بننا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ نواب شاہ میں پہلے سے مشرق کا نامہ نگار موجود ہے اس لئے کسی نئی تقرری کا کوئی جواز نہیں۔ مگر اس شخص نے اصرار کیا میں اس سلسلہ میں عزیز احمد صاحب سے بات کر دوں۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر عزیز احمد چاہیں تو خود مجھ سے بات کر سکتے ہیں۔ اس وقت تو وہ شخص چلا گیا، لیکن اگلے روز مجھے عزیز احمد کی طرف سے سفارش موصول ہوئی کہ وہ ایک شخص کو میرے پاس بھیج رہے ہیں۔ جسے فوری طور پر نواب شاہ میں مشرق کا نامہ نگار مقرر کر دیا جائے۔ اسی شام کو وہ شخص تقرر نامہ لینے کے لئے آ گیا۔ میں حیران تھا کہ عزیز احمد نے تو بڑے سے بڑے معاملات میں بھی کبھی مداخلت نہیں کی تھی، وہ ایک معمولی معاملے میں سفارش کرنے

پر کیسے تیار ہو گئے تھے۔

میں اس شخص سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا "چیئرمین تو صاحب قسم کے آدمی ہیں۔ آپ کی رسائی ان تک کیسے ہوتی؟ انہوں نے تو کبھی کسی کی سفارش نہیں کی۔"

اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا: "سفارش کیسے نہ کرتے۔ میں بھٹو صاحب کا آرڈر لے کر آیا تھا۔"

میں ایک دم چونکا۔ مگر پھر سنبھل کر بولا۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں۔ بھٹو صاحب کا تو نام بھی ہمارے اخبار میں نہیں چھپ سکتا۔ ہمارے چیئرمین کو بھٹو صاحب آرڈر کیسے دے سکتے ہیں؟"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "میں بھٹو صاحب کا ہی خط لے کر آیا تھا۔"

"کیا خط لکھا تھا بھٹو صاحب نے؟" میں نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"صرف دو جملے۔ مائی ڈیئر عزیز احمد، رقعے کے حامل کا کام فوراً کر دو۔" اس شخص نے جواب دیا۔

میں نے یہ واقعہ اس لئے درج کیا ہے کہ قارئین ان خفیہ روابط کے بارے میں جان سکیں جو بھٹو نے ایوب خان کے "وفادار" افسروں کے ساتھ قائم کر رکھے تھے۔ حیرت کی بات میرے لئے یہ تھی کہ "امریکی لابی" سے تعلق رکھنے والے عزیز احمد اور بھٹو جیسے پُرجوش چین نواز کے درمیان قدرِ مشترک آخر کیا ہے؟ عزیز احمد کو تو بھٹو کے سائے سے بھی بھاگنا چاہیئے۔ وہ ایسے خطرناک حالات میں بھی سابق وزیر خارجہ کے احکامات کی تعمیل کرنا ضروری کیوں سمجھتے ہیں۔؟

چند ہی روز بعد میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایوب خان کا سابق وزیر خارجہ معتوب ہونے کے باوجود ایوب خاں کی افسر شاہی پر کس قدر حاوی تھا۔

الجزائر کے یوم آزادی پر الجزائری سفارت خانے میں ایک تقریب ہو رہی تھی۔ اس تقریب میں، میں بھی شریک تھا۔ ممتاز سرکاری اور غیر سرکاری شخصیتوں میں عزیز احمد بھی وہاں موجود تھے اور ایک کونے میں بیٹھے چند دوسرے افسروں کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے۔ اچانک وہ خاموش ہو گئے اور ان کے ساتھ دوسرے افسر بھی خاموش ہو گئے۔ ان کی نظریں سامنے کاریڈار کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے بھی اس جانب دیکھا۔ بھٹو شانِ بے نیازی کے ساتھ چلتا آ رہا تھا۔ وہ ابھی چند گز کے فاصلے پر تھا کہ عزیز احمد اور دوسرے افسر بڑے مؤدبانہ انداز میں کھڑے ہو گئے بھٹو نے قریب سے گزرتے وقت مسکراتی ہوئی نظر ان پر ڈالی اور انگریزی میں کہا۔
"کیسے ہو عزیز؟ اور تم قرنی؟"

"فائن سر" عزیز احمد نے جواب دیا۔ "تھینک یو سر" قرنی نے کہا۔

بھٹو تو آگے بڑھ گیا مگر اسے "سر" کہنے والے افسر دیر تک مؤدبانہ اور نیاز مندانہ انداز میں کھڑے رہے۔ اس وقت تک کھڑے رہے، جب تک بھٹو ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

میں یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میرے "ہیرو" کی قد آور شخصیت کے سامنے یہ لوگ کس قدر "بونے" لگ رہے ہیں۔ ایوب خان کو اگر پتہ چل جائے کہ انہوں نے بھٹو کو "سر" کہا ہے تو ان کی زبانیں کاٹ دی جائیں، لیکن پھر بھی میرے ہیرو کے سامنے یہ کتنی تابعداری کے ساتھ دم ہلا رہے ہیں۔

○

بھٹو کی داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے میں یہاں شیخ مجیب الرحمان کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جسے اگرتلہ سازش کیس میں ملوث کر کے گرفتار

کیا جا چکا تھا۔ اس گرفتاری نے شیخ مجیب الرحمان کو مشرقی پاکستان میں ایک قومی ہیرو کا درجہ دے دیا تھا اور وہاں کے عوام اس کی پرستش کرنے لگے تھے۔ اگر اگرتلہ نامی مقام پر واقعی کوئی سازش ہوئی تھی اور اس سازش کا مقصد مشرقی پاکستان کو باقی ملک سے الگ کر کے بھارت کی گود میں ڈالنا تھا تو ایوب خان اس سازش کے بارے میں تمام حقائق ناقابلِ تردید شہادتوں کے ساتھ منظرِ عام پر لانے میں ناکام ہو گئے تھے۔ اس وقت میں بھی اپنے لاکھوں ہم وطنوں کی طرح "ملکی سالمیت" اور 'قومی یکجہتی' جیسے پُرکشش نعروں کے جال میں پھنسا ہوا تھا اور ان اسباب پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جو سراج الدولہ اور ٹیپو میر کے جانشینوں کو اس پاکستان سے دور لے جا رہے تھے جس کے قیام کے لئے انہوں نے ناقابلِ فراموش قربانیاں دی تھیں۔ کاش کہ میں اور میرے لاکھوں ہم وطن اس وقت یہ جان لیتے کہ مغربی پاکستان کے چند مفاد پرست سیاست دانوں نے مشرقی پاکستان کی فضاؤں میں سلطانیٔ جمہور، کے لئے اٹھنے والی ہر آواز کو غداری کی آواز قرار دینے کا وطیرہ محض اپنی مقتدر حیثیت اور بالادستی کو برقرار رکھنے کے لئے اختیار کر رکھا ہے! کاش کہ جب ایوبی آمریت اپنے سب سے بڑے دشمن شیخ مجیب الرحمٰن کو اگرتلہ سازش کیس کا ملزم نمبر ایک قرار دے کر زنداں کی دیواروں کے پیچھے پھینک چکی تھی تو اہلِ کشمیر کے حقوق کے لئے جنگ لڑنے والے مغربی پاکستانی اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے بھی اسی طرح سڑکوں پر نکل آتے جس طرح وہ اعلانِ تاشقند کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے نکلے تھے۔! اگر ایسا ہوتا اور شیخ مجیب الرحمان کی رہائی کے لئے تحریک اسی زمانے میں شروع ہوتی اور کراچی لاہور راولپنڈی پشاور اور کوئٹہ سے شروع ہو کر ڈھاکہ چاٹگام اور راجشاہی وغیرہ تک پہنچتی تو وہ نظریاتی زنجیر جس نے سینکڑوں میل کے فاصلے پر قائم دو

مختلف جغرافیائی خطوں کو ایک قوم اور ایک ملک کے قالب میں جکڑ دیا تھا اس مقدس زنجیر کو توڑنا دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے بس کی بات نہ ہوتی۔ اس مقدس زنجیر کو ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے توڑا۔ ہم بھول گئے کہ ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے بھائی بھی جوان ہو کر اپنے اپنے معاملات میں خود مختار ہونا پسند کرتے ہیں۔ خود مختاری کی اس فطری خواہش کو ماں کی کوکھ سے غداری قرار دینا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ بڑا بھائی بھی چھوٹے بھائی پر حکومت کرے تو چھوٹا بھائی اسے اپنے حقوق کی نفی تصور کرتا ہے۔ اور مشرقی پاکستان تو مغربی پاکستان کا بڑا بھائی تھا۔

اب میں پھر اپنے "ہیرو" بھٹو کی طرف لوٹتا ہوں۔ شمعِ جمہوریت کے اس پروانے نے شیخ مجیب الرحمان کی گرفتاری کو خاموشی سے کیوں برداشت کیا؟ عوام کو اعلانِ تاشقند کے خلاف مشتعل کرتے وقت اس نے شیخ مجیب الرحمان کی گرفتاری سے پیدا ہونے والے خطرات کا ذکر کیوں نہ کیا؟ اعلانِ تاشقند کا تعلق تو اس کشمیر سے تھا جو فی الواقعہ بھارت کے قبضے میں تھا اور جسے آزاد کرانے کی قومی خواہش کی تکمیل کے لئے ناقابل تصور قربانیوں کی ضرورت تھی اور شیخ مجیب الرحمان کی گرفتاری سے پیدا ہونے والی صورت حال کا تعلق اس مشرقی پاکستان سے تھا جو ہمارے وجود کا حصہ تھا اور ہمارے ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی کا صوبہ تھا۔ بھٹو نے ہمیں یہ کیوں نہ بتایا کہ کشمیر کو بھارتی چنگل سے آزاد کرنے کی بات ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں اس وقت ہمیں اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں کی ان امنگوں کی بات کرنی چاہیئے جنہیں کچلنے کے نتائج پورے پاکستان کے لئے تباہ کن ہو سکتے ہیں۔

لیکن بھٹو یہ سب کچھ ہمیں کیوں بتاتا؟ اس کا تو مفاد ہی اس بات میں تھا کہ ایوبی آمریت مشرقی پاکستان کے عوامی احساسات کو زیادہ سے زیادہ قوت کے ساتھ کچلے تاکہ وہاں علیحدگی پسندی کے رجحانات زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ

جڑیں پکڑ سکیں۔

شیخ مجیب الرحمان کی رہائی کا مطالبہ بھٹو نے اس دور میں جا کر کیا جب مشرقی پاکستان کے عوام اسلام آباد کو اپنے ملک کے دارالحکومت کی نہیں بلکہ ان حاکموں کے دارالاقتدار کی حیثیت دینے لگے تھے جن کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔ اس دور میں بھٹو کے مفادات کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ شیخ مجیب الرحمان زندان سے باہر آ کر ملک کے اس حصے کی قیادت سنبھال لے جس سے بھٹو کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں شیخ مجیب الرحمان کو یہاں "قومی ہیرو" یا "مشعل بردار جمہوریت" کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ اس زمانے میں، میں بھی ان لاکھوں لوگوں کے ساتھ تھا جو شیخ مجیب الرحمان کو غدار اور بھارت کا ایجنٹ وغیرہ قرار دیا کرتے تھے، لیکن سقوط مشرقی پاکستان کے المیے نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ممکن ہے کہ آج بھی میرے بے شمار ہم وطن شیخ مجیب الرحمان کو علیحدگی پسند اور غدار تصور کرتے ہوں۔ میں "ملکی سالمیت اور قومی یک جہتی" کے ایسے پروانوں کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو راستہ شیخ مجیب الرحمان نے اختیار کیا اس راستے پر اسے ہم نے ڈالا تھا۔ وہ حالات ہم نے پیدا کئے تھے۔ شیخ مجیب الرحمان جن کا قیدی بن کر رہ گیا۔ اگر شیخ مجیب الرحمان ان حالات کی قید سے نہ نکل سکا تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے اپنے کانوں میں "ملکی سالمیت اور قومی یک جہتی" کی انگلیاں ٹھونس لی تھیں اور ہم اسکی باتیں سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ مجرم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں حالات کسی جرم کی طرف دھکیلتے ہیں۔ اگر شیخ مجیب الرحمان مجرم تھا تو اس کا تعلق مجرموں کی اس قسم سے تھا۔ دوسری قسم کے مجرم وہ ہوتے ہیں جو مجرمانہ فطرت اور مجرمانہ ضمیر لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ اور جو حالات کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے مطابق ڈھال لیا کرتے ہیں۔ اگر بھٹو اس قسم کا مجرم نہیں تو پھر میں یہ کہوں گا کہ دنیا

کی تاریخ میں کوئی مجرم پیدا ہی نہیں ہوا۔

اور قدرت اس مجرم کو ہماری تقدیر بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی تاکہ ہمیں ان گناہوں کی مناسب سزا مل سکے جن کا ارتکاب ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر برسہابرس سے کر رہے تھے۔

۱۹۶۷ء کی سردیوں میں "مردِ آہن" ایوب خان پر ایک خطرناک بیماری کا حملہ ہوا۔ قوم سے اس خطرناک بیماری کو چھپانے کی پوری کوشش کی گئی، لیکن اس قسم کی باتیں چھپی نہیں رہ سکتیں۔ صدر پاکستان کا اچانک منظرِ سیاست سے یکسر غائب ہو جانا کسی معمولی بیماری کی وجہ سے نہیں تھا۔ یہ بیماری اس قدر خطرناک تھی کہ چند روز کے لئے ایوب خان کو موت اور زندگی کی کش مکش میں بھی رہنا پڑا۔ اگرچہ وہ موت کو شکست دینے اور طویل آرام کے بعد پوری طرح صحت یاب ہونے میں کامیاب ہو گئے مگر ان کی بیماری مختلف سطحوں پر اپنے اثرات مرتب کر چکی تھی۔ خود ایوب خاں کو احساس ہو گیا کہ ان کی شخصیت طاقت کا ایسا پہاڑ ہرگز نہیں جو اپنی جگہ سے ہٹایا نہ جا سکے۔ موت کے منہ کے قریب جا واپس آنے کے نتیجے میں ان کے اس یقین کا متزلزل ہونا ایک فطری امر تھا کہ وہ ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی قوت اور قدرت رکھتے ہیں۔

اور فوج کے وہ جنرل جنہوں نے اپنی شخصیتوں کو ایوب خان کے جاہ و جلال قوت و حشمت اور رعب و دبدبے کے تابع کر رکھا تھا، انہیں یکایک یہ احساس ہوا کہ یہ مردِ آہن اپنی تمام تر طاقت کے باوجود ایک فانی انسان ہے اور اس کو بھی جلد یا بدیر موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ یکایک ان جنرلوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ایوب خاں جلد یا بدیر افقِ سیاست سے غائب ہو سکتے ہیں۔ مسندِ اقتدار سے ہٹ سکتے ہیں۔ اور یوں ملک میں کسی وقت بھی قیادت کا خلا پیدا ہو سکتا ہے۔ جسے بہر حال پُر

کرنا پڑے گا۔

بری افواج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے جنرل یحییٰ خان اپنے آپ کو سب سے زیادہ طاقت ور فوجی شخصیت سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ جب ایوب خان موت اور زندگی کی کش مکش میں تھے اسی وقت جنرل یحییٰ خان نے سوچنا شروع کر دیا ہوگا کہ وہ ایک ایسے عہدے پر فائز ہیں جو آنے والے ایام میں طاقت کا حقیقی سرچشمہ بن سکتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ایوب خان بھی فوجی پہلے اور سیاستدان بعد میں تھے ۔ ایوب خان کے بعد بھی فوج کی طاقت قیادت کے خلا کو پر کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکتی تھی۔ یحییٰ خان یہ بھی جانتے تھے کہ فوج کے کچھ جنرلوں نے ایوب خان سے ناراض ہو کر اپنا مستقبل خفیہ طور پر بھٹو کی مقبولیت سے وابستہ کر رکھا ہے۔ ان جنرلوں میں پیرزادہ، عمر اور مٹھا خان خاصی اہمیت کے حامل تھے۔ یحییٰ خان نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ تمام جنرل جو کسی نہ کسی وجہ سے ایوب خان سے بدظن ہو چکے تھے انہیں بھٹو کے حلقۂ اثر سے نکالنا شروع کر دیا۔ یحییٰ خاں کی دلیل یہ تھی کہ فوجیوں کو کسی سیاست دان کے ہاتھوں میں کھیلنے یا اس کے عزائم کی تکمیل کے لئے "مہروں" کے طور پر استعمال ہونے کی بجائے خود اپنی فیصلہ کن قوت اور حیثیت پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ یہ دلیل خاصی وزنی تھی۔ چنانچہ کچھ جنرلوں نے اپنا مستقبل یحییٰ خان کے ساتھ وابستہ کرنے میں کوئی باک نہ سمجھا، لیکن کچھ جنرل پھر بھی ایسے تھے جو تمام راستوں کو کھلا رکھنا اپنے لئے زیادہ مفید تصور کرتے تھے وہ جنرل یحییٰ خان کے ساتھ بھی رہے اور ان کا رابطہ بھٹو کے ساتھ بھی قائم رہا۔ پس پردہ کھیلے جانے والے اس کھیل میں ائر مارشل نور خان نے بھی بھرپور حصہ لیا جو اس وقت فضائیہ کے سربراہ تھے۔ نور خاں بھی قومی سیاست کے افق پر طلوع ہونے کے خواب دیکھنے لگے تھے اور ان کا خیال تھا کہ بھٹو کو ایوبی آمریت پر وار کرنے کے لئے استعمال تو کیا

جا سکتا ہے، لیکن اسے یہ موقع نہیں دینا چاہیئے کہ وہ فوج کی مدد سے ایوب خان کا جانشین بن جائے۔

بھٹو بھی آگاہ ہو چکا تھا کہ فوج کے اندر ایک طاقتور گروپ قائم ہو گیا ہے جو خود کچھ عزائم رکھتا ہے اس گروپ کے ظہور نے اس بات کا امکان خاصا کم کر دیا تھا کہ اقتدار بھٹو کو تھالی میں سجا کر پیش کیا جائے گا۔ اب چند جنرلوں کی زبانی حمایت پر بھروسہ کئے رکھنا مناسب نہیں تھا۔ اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ کہیں امریکہ نے اس کے علاوہ کسی اور گھوڑے پر بھی بازی نہ لگا رکھی ہو۔ چنانچہ اس نے اپنی منصوبہ بندی میں کچھ تبدیلیاں کیں اور اس کی نظریں ایک ایسے شخص پر جم گئیں جو ایوبی آمریت کی بنیادیں ہلا ڈالنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔ اس شخص کا ذکر میں سرسری طور پر کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ اسے تاریخ پاکستان میں ایک منفرد مقام حاصل ہو چکا ہے۔ ایوبی آمریت پر فیصلہ کن وار اسی شخص نے کیا۔ بھٹو کے راستے سے رکاوٹ کا سب سے بڑا پتھر اسی شخص نے ہٹایا۔ اقتدار کی منزل کی طرف بھٹو کے طوفانی سفر کو آسان بنانے کا کام اسی شخص نے انجام دیا۔ اور یہ کام بھی قدرت نے اسی شخص کے سپرد کیا کہ ایک آمریت کو ختم کر کے اس نے جس دوسری آمریت کے لئے راہیں ہموار کیں اس کے خلاف طویل اور صبر آزما جنگ بھی وہ خود لڑے۔

ایوب خان کی آمریت یحییٰ خاں کے مارشل لاء اور بھٹو کے دورِ استبداد کے خلاف پورے نو برس تک برسرپیکار رہنے والے اس شخص کے کردار کا تفصیلی جائزہ میں آنے والے ابواب میں لوں گا۔

یہاں میں اس جشن کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ایوب خان کے دس سالہ "دورِ ترقی و خوشحالی" کے سلسلہ میں بڑے اہتمام کے ساتھ منایا گیا۔ یہ جشن کئی سرکاری اداروں کی طرف سے کئی ماہ تک کچھ اس انداز سے منایا گیا جیسے ایوب خاں مزید

دس برس تک قوم پر مسلط رہنے کا پختہ ارادہ رکھتے تھے۔ اس جشن کے دوران ایوب خاں کے دس سالہ دور میں ہونے والی "شاندار" ترقی کے متعلق جو زبردست پروپیگنڈا ہوا اس نے عوام کے ذہنوں پر مثبت اثرات مرتب کرنے کی بجائے انہیں نفسیاتی طور پر اس احساس میں مبتلا کر دیا کہ ان کی مجبوری اور بے بسی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے یہی وہ احساس تھا جو راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی مانند بھڑک کر شعلہ بننے والا تھا۔ بھٹو کو جس چنگاری کی ضرورت تھی ایوب خان کے پروپیگنڈہ باز خود ہی اسے مہیا کر رہے تھے۔ ان پروپیگنڈہ بازوں نے ایوب خان کو اسلام کا محافظ ثابت کرنے کے لئے بھٹو کے خلاف "سوشلزم کفر ہے" کا نعرہ بھی خاصی کثرت کے ساتھ استعمال کیا حاکمِ وقت کا اشارہ پا کر فتووں کی بھرمار کرنے والے "کرائے کے مولویوں" کی کمی ہمارے ملک میں کبھی نہیں رہی۔ مجھے وہ فتویٰ اچھی طرح یاد ہے جو مولانا کوثر نیازی نے بادشاہی مسجد لاہور کے امام کے ساتھ مل کر بھٹو کے خلاف دیا تھا۔ اس فتوے میں سوشلزم کا نام لینے والے بھٹو کو دین کا دشمن قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیا گیا تھا۔

۳۰۔ اپریل ۱۹۶۸ء کے روزنامہ مشرق کے صفحہ اول پر شائع ہونے والے اس فتوے کا تراشہ اب بھی میرے ریکارڈ میں موجود ہے۔ میں کسی دوسرے مولانا کوثر نیازی کا ذکر نہیں کر رہا۔ اسی مولانا کوثر نیازی کا ذکر کر رہا ہوں جو گزشتہ چھ برس سے بھٹو کو دنیائے اسلام کا ایک بطلِ جلیل اور مسلم تاریخ کا ایک عظیم سپاہی ثابت کرنے کا "دینی" فریضہ بڑی "دیانت داری اور لگن" کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ محمدؐ کے دین کے ساتھ شرمناک مذاق کرنے والے لوگوں پر محمدؐ کے خدا کا قہر و غضب کیوں نہیں ٹوٹتا۔

---

# اصغر خان کا ظہور

اگر آئینِ الٰہی یہ ہوتا کہ
غربت موروثی ہو اور امارت
موروثی ہو ، محکومی موروثی
ہو اور حاکمیت موروثی ہو،
ظلم سہنے کی تقدیر موروثی
ہو اور ظلم کرنے کا حق موروثی
ہو تو محمد صلی اللہ علیہ
وسلم کا خدا آپؐ کو
رحمت العالمین بنا کر
کیوں بھیجتا ؟

ایوبی اقتدار کی دسویں سالگرہ کے موقع پر بھٹو کو وہ اشارہ مل گیا جس کا اسے انتظار تھا۔ یہ اشارہ سی آئی اے کی طرف سے ملا یا ان جنرلوں کی طرف سے جو درپردہ اس کے ساتھ ساز باز کرتے رہے تھے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یحییٰ خان اور نور خان نے بالواسطہ طور پر بھٹو تک یہ بات پہنچا دی تھی کہ اگر ایوب خان کے خلاف کوئی بڑی تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک کے نتیجے میں امن عامہ کی صورت حال سول انتظامیہ کے کنٹرول سے باہر ہو گئی تو فوج ایوب خاں کے اقتدار کو بچانے کے لئے کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کرے گی۔

تحریک کا باقاعدہ آغاز کرنے سے قبل بھٹو طلبا کی تنظیموں اور مزدور یونینوں کے لیڈروں کو پوری طرح اپنے جال میں پھنسا چکا تھا۔ ایوبی دور کی شاندار ترقی کے پروپگنڈے کو بے اثر بنانے کے لئے چینی کی مہنگائی کے مسئلے کو بڑی کامیابی کے ساتھ ایکسپلائٹ کیا گیا تھا۔

تحریک شروع کرنے کے لئے بھٹو کو ایک بہانے کی ضرورت تھی جو ایوب خان کی انتظامیہ نے اسے فراہم کر دیا۔ راولپنڈی کے قریب پولیس کے ساتھ ایک چھوٹے سے جلوس کی جھڑپ میں ایک نوجوان جاں بحق ہو گیا۔ اس نوجوان کی ہلاکت نے دورِ ایوب پر مہرِ اختتام ثبت کر دی۔

اشارہ پانے کے بعد میدانِ عمل میں کودنے کا اس سے بہتر موقع بھٹو کو کیا مل سکتا تھا۔؟ ایوبی آمریت کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کے لیئے بھٹو نے پشاور کا شہر منتخب کیا۔ جہاں اس کا استقبال اتنے بڑے پیمانے پر ہوا کہ ایوب خاں کی حکومت ایک دم بوکھلا اٹھی۔ بھٹو نے آناً فاناً پشاور سے کراچی تک آگ لگانے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ ایوب خان اسے اس پروگرام پر عملدرآمد کرنے کا زیادہ موقع نہیں دیں گے۔ اس کا یہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ ایوب خاں کی انتظامیہ اس کے اندازے سے پہلے حرکت میں آگئی۔ بھٹو اعلان کر چکا تھا کہ وہ لاہور پہنچ کر اعلان تاشقند کے راز پر سے پردہ اٹھائے گا۔ یہ محض ایک سٹنٹ تھا جو کامیاب ثابت ہوا۔ بھٹو کو لاہور پہنچنے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا اور یوں پیپلز پارٹی کا جتیرین عوام میں یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ اسے اعلانِ تاشقند کے راز کو افشا کرنے سے روکنے کے لیئے گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایوب خاں نے واقعی تاشقند میں کوئی ایسا سودا کیا تھا جس کا بھٹو کو علم تھا اور وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ان کا سابق وزیر خارجہ بیچ عوام کے سامنے ان کا بھانڈا نہ پھوڑ دے ایوب خان نے بھٹو کو گرفتار کرنے سے پہلے اس پہلو پر یقیناً غور نہیں کیا ہوگا۔ ان کا مقصد تو فتنے کو ابھرنے کا موقع دینے سے پہلے کچل کر رکھ دینا تھا۔ بھٹو کی گرفتاری کے بعد ایک دم جو سناٹا طاری ہوا اور پیپلز پارٹی کے باقی لیڈر جس سراسیمگی کا شکار ہو کر خاموشی سے بیٹھ گئے اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ایوب خان کی حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ تحریک چلانے کے لیئے لیڈر کی ضرورت تھی اور لیڈر کو ایوب خان نے پکڑ لیا تھا۔ پیپلز پارٹی میں کوئی ایسی شخصیت نہیں تھی جو لیڈرشپ کا خلا پُر کر کے تحریک کو آگے بڑھا سکے۔ لیکن بھٹو نے اتنی بڑی بازی بغیر کسی یقین دہانی کے نہیں لگائی تھی۔ اس نے ایک ایسے شخص سے عوامی تحریک کی قیادت اپنے

ہاتھ میں لے لینے کا وعدہ لیا ہوا تھا جس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ایوبی انتظامیہ کو دس بار نتائج کے بارے میں سوچنا پڑتا۔ یہ شخص فضائیہ کا سربراہ رہ چکا تھا اور اسے پاکستان کی فضائی قوت کا معمار تصور کیا جاتا تھا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کے بعد اس نے کچھ عرصے تک ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اس نے پی آئی اے کی سربراہی بھی کی تھی اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اس نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا اور اس کی پوری زندگی فرض شناسی، دیانت داری اخلاقی قوت اور حب الوطنی کی منہ بولتی تصویر تھی اس کے دامن پر کوئی ایسا داغ نہیں تھا جس پر انگلی اٹھائی جا سکے۔ ملک کے چند اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود اس نے اپنے کردار کو بے داغ رکھا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے بدترین دشمن بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور تھے۔ بھٹو کو مقاصد کی تکمیل کے لئے ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو آہنی قوتِ ارادی کے ساتھ ایوبی آمریت کو للکارنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور ایوبی انتظامیہ جس پر آسانی کے ساتھ ہاتھ نہ ڈال سکے۔ یہ بھٹو کی خوش قسمتی تھی کہ اصغر خان جمہوری حقوق کی بحالی اور ملک میں منصفانہ سیاسی نظام کے قیام کی خاطر اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے اور یہ قوم کی بدقسمتی تھی کہ اس وقت اصغر خان کے اپنے کوئی سیاسی عزائم نہیں تھے وہ صرف ایوبی آمریت کی بنیادیں ہلانے اور ملک میں حقیقی جمہوریت کے لئے راستہ ہموار کرنے کے محدود مقصد کی خاطر میدانِ سیاست میں کود پڑے تھے۔ اگر اس وقت انہیں اندازہ ہوتا کہ جو محدود مقصد انہیں میدانِ سیاست میں لایا ہے اس کا حصول ملک و ملت پر تباہی کے دروازے کھول دے گا تو وہ بھٹو کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنسنے کی بجائے کوئی ایسا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے کہ قوم کو ایوبی آمریت سے بھی نجات ہو جاتی اور ملک ایک ایسے سازشی دماغ کا نشانہ بننے سے بھی بچ جاتا جس میں کرسیٔ اقتدار تک پہنچنے کا بڑا ہی

خوفناک منصوبہ پرورش پا رہا تھا۔

لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ اصغر خان کی اصول پسندی بھٹو کی ہوسِ اقتدار کی تکمیل کا باعث بنے۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب خبر آئی کہ ریٹائرڈ ایئر مارشل اصغر خان بھٹو کی گرفتاری سے پیدا ہونے والی صورتِ حال پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے ایبٹ آباد سے لاہور تشریف لا رہے ہیں۔

میں پریس ٹرسٹ کی ملازمت ترک کرنے کے بعد روزنامہ مشرق کے مینجنگ ڈائریکٹر عنایت اللہ مرحوم کی زیرِ سرپرستی ایک آزاد ادارہ قائم کر چکا تھا جس کا مقصد اعلیٰ معیار کے ایسے جرائد کا سلسلہ شروع کرنا تھا جو زندگی کے مختلف شعبوں کی بھرپور عکاسی کریں اور معنوی اور صوری اعتبار سے معیاری صحافت کا چیلنج قبول کریں ابتداً میں "ٹائم" اور "نیوز ویک" کی طرز پر ایک ہمہ گیر ویکلی شائع کرنے کا پروگرام تھا لیکن عنایت اللہ مرحوم کی توجہ میں نے ایوبی آمریت کی ان پابندیوں کی طرف مبذول کرائی جن کی موجودگی میں دیانت دارانہ سیاسی صحافت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ جرائد کے مجوزہ سلسلے کا آغاز ایک ایسے ہفت روزہ سے کیا جائے جو زندگی کے تفریحی شعبے میں تعمیری کردار ادا کرے۔ اس ہفت روزہ کا نام مصوّر تھا۔ وہی مصوّر جس نے ۶ ستمبر ۱۹۶۸ء سے ۳۰ اپریل ۱۹۷۱ء تک فلمی صنعت میں پائے جانے والے تخریبی اور منفی رجحانات کے خلاف زبردست جنگ لڑی۔ میرے قلم سے سیاسی اظہارِ خیال کی آزادی چھین لی گئی تھی، لیکن اب مجھے ایک ایسا پلیٹ فارم مل گیا جہاں سے میں بے حسی اور بے ضمیری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ملک دشمنوں کے اس ان پڑھ اور بے شعور طبقے کے خلاف جنگ لڑ سکتا تھا جو قومی کردار کی تشکیل میں اہم ترین کردار کرنے والے ذریعہ ابلاغ

رہا بقی تھا۔ میں یہ جنگ ہار گیا کیوں کہ فلمی صنعت نے روزنامہ مشرق میں فلمی اشتہارات کی اشاعت بند کر دی۔ میرے خلاف فلمی صنعت کو حنیف رامے کے روزنامہ مساوات کی پوری حمایت حاصل تھی اور روزنامہ مشرق پانچ لاکھ روپے کا خسارہ برداشت کرنے کے بعد فلم ڈسٹری بیوٹرز ایسوسی ایشن اور فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے مطالبات ماننے پر مجبور ہو گیا۔ ایک مطالبہ یہ تھا مجھے مصور سے الگ کر دیا جائے اور دوسرا مطالبہ یہ کہ مصور اپنے اداریئے میں پوری فلم انڈسٹری سے معافی مانگے۔ عنایت اللہ مرحوم میرے استاد بھی تھے، محسن بھی اور قدر دان بھی۔ انہیں یہ بات گوارہ نہیں تھی کہ میں مصور سے الگ ہو جاؤں۔ چنانچہ انہوں نے یہ راستہ نکالا کہ ایڈیٹر کوئی اور مقرر کر دیا جائے اور میں بدستور مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت کام کرتا رہوں۔ میں نے اس تجویز کو مسترد کر کے خود ہی مصور سے مکمل علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں معاشی تحفظ کے لئے ان اصولوں کی قربانی دینے کے تیار نہیں تھا جن کی خاطر میں نے پہلے کوہستان اور پھر مشرق سے علیحدگی اختیار کی تھی۔

میں نے اپنے بارے میں یہ سب کچھ اس لئے لکھا ہے کہ بنیادی طور پر یہ کہانی بھٹو کی نہیں میرے اپنے احساسات کی ہے۔ ان احساسات کی جو بھٹو کے ساتھ وابستہ تھے تو وہ میری نظر میں ملتِ پاک کا نجات دہندہ تھا اور جب بھٹو کے خلاف ہوئے تو وہ میری نظر میں تاریخِ پاک کا سب سے بڑا مجرم بن گیا میں نے بھٹو کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے اپنے احساسات اور اپنے شعور کی روشنی میں لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ بے شمار لوگ میرے احساسات اور میرے شعور سے اتفاق نہ کرتے ہوں، لیکن ایسے لوگوں کو میں یہ ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ مجھ جیسے انتہا پسندوں کی سیاسی وفاداریاں مصلحتوں اور مفادات کے تابع نہیں ہوتیں۔ شعور اور احساسات کے تابع ہوتی ہیں۔ جب میرے شعور اور میرے احساسات کی آنچ

بھٹو کے جھوٹ کو سچ سمجھ رہی تھی تو میں اسے اپنا ہیرو مانتا تھا، لیکن جب میرے شعور اور میرے احساسات کی آنکھ نے آبروئے وطن کو لٹتے دیکھا، تقدیسِ پاکستان کی دھجیاں بکھرتے دیکھیں تو مجھے پتہ چلا کہ جو خنجر میرے خوابوں کی پشت میں گھونپا گیا ہے اسے پکڑنے والا ہاتھ میرے "ہیرو" کا ہے۔ میں اپنے خوابوں کے قاتل کو کیسے معاف کر دوں ؟۔

○ ○

میں اس دن کا ذکر کر رہا تھا کہ جب ائر مارشل اصغر خان لاہور پہنچ کر قومی سیاست میں عملی حصہ لینے کا اعلان کرنے والے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ میں مشرق کے مینیجنگ ڈائریکٹر عنایت اللہ مرحوم سے ملاقات کے لئے ان کی کوٹھی پر گیا۔ وہاں مولانا کوثر نیازی بھی تھا جس سے میرا تعارف کوہستان کے زمانے سے تھا۔ کچھ اور لوگ بھی تھے جنہیں میں قابلِ ذکر نہیں سمجھتا۔

اس سوال پر گفتگو ہو رہی تھی کہ قومی سیاست میں اصغر خان کی آمد سے حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ کوثر نیازی کا خیال تھا کہ بھٹو جیسا شاطر اور چالباز آدمی اگر ایوب خان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تو اصغر خاں جیسے سیدھے سادے شریف اور اصول پسند آدمی سے ایوب خان کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ عنایت اللہ مرحوم خود بہت کم باتیں کیا کرتے تھے اور دوسروں کی باتیں زیادہ سنا کرتے تھے۔ وہ کافی دیر تک کوثر نیازی کے دلائل سنتے رہے۔ پھر اچانک انہوں نے کہا۔

"آپ سیاست دان ہیں مولانا! لیکن میں اس معاملے کو صرف ایک اخبار نویس کی حیثیت سے دیکھ رہا ہوں۔ اصغر خان کی آمد سے اخبارات میں تو دلچسپی پیدا ہو جائے گی"۔

"اور میرے خیال میں بھٹو کی تحریک کو بھی تقویت ملے گی" میں بول پڑا۔
"اکبر صاحب بھٹو کے بڑے شیدائی ہیں۔ مولانا۔ آپ ان سے بحث کریں"
عنایت اللہ مرحوم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"میں نہیں مانتا کہ اکبر صاحب بھٹو جیسے دشمن دین کے شیدائی ہوں گے بھٹو سوشلزم کا پرچار کر کے دین کے خلاف ایک فتنہ کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ اسلام سے محبت کرنے والے تمام لوگوں کو اس فتنے کا سدباب کرنے میں ایوب خان کی حمایت کرنی چاہیئے" کوثر نیازی نے خالص ناصحانہ انداز میں کہا۔
"بھٹو اسلام کی بھی تو بات کرتا ہے مولانا" میں نے کہا۔
"صرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے" کوثر نیازی نے جواب دیا "لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا"
"میں آپ کے خیالات کا احترام کرتا ہوں مولانا، لیکن میری ایک بات یاد رکھیئے بھٹو کی تحریک ضرور کامیاب ہوگی۔ اس لئے کامیاب ہوگی کہ وہ عوام کی امنگوں کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اب عوام بے بسی اور غربت کو اپنی تقدیر بنائے رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ اپنی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں۔ اگر ایک شخص بھوکا رہتا ہے اسے پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔ اس کے بدن پر لباس نہیں ہوتا۔ اس کے پاس سر چھپانے کے لئے جگہ نہیں ہوتی، گرمیوں میں وہ جھلستا ہے اور سردیوں میں ٹھٹھرتا رہتا ہے بیماری میں اسے دوا نہیں ملتی۔ آپ اور مجھ جیسے لوگ اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اسے حقیر سمجھتے ہیں۔ اسے اپنے پاس بٹھانا پسند نہیں کرتے۔ تو یہ اس شخص کی تقدیر نہیں مجبوری ہے اور یہ مجبوری اسے رب غفور و رحیم نے نہیں دی۔ اس معاشرے نے دی ہے۔ جس کی باگ ڈور جابروں اور ظالموں کے ہاتھ میں ہے اگر آئین الٰہی یہی ہوتا کہ غربت موروثی ہو اور امارت موروثی ہو، محکومی موروثی ہو اور

حاکمیت موروثی ہو، جہالت موروثی ہو اور تعلیم یافتہ ہونے کا حق موروثی ہو، ظلم سہنے کی تقدیر موروثی ہو اور ظلم کرنے کا حق موروثی ہو، تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا محمدؐ کو رحمت اللعالمینؐ بنا کر کیوں بھیجتا؟ محمدؐ کا اسلام انسان کی تقدیر بدلنے کے لئے آیا تھا۔ محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کرنے کے لئے آیا تھا۔ آپ جس اسلام کی باتیں کرتے ہیں اسے امراء رؤسا سلاطین اور بادشاہوں نے اپنی امارتوں، ریاستوں سلطنتوں اور بادشاہتوں کے تحفظ کے لئے ایجاد کیا۔ غربت کو غریب کی تقدیر اور امارت کو امیر کی تقدیر قرار دینے والے اسلام کو سوشلزم سے واقعی ڈرنا چاہیئے مگر وہ اسلام جس کا بانی اور ہادی پیوند لگا لباس پہنتا تھا۔ اس کے اسلام کو سوشلزم یا کسی اور ازم سے کوئی خطرہ نہیں۔"

"آپ تو بڑے انقلابی خیالات رکھتے ہیں"۔ کوثر نیازی نے لاجواب ہو کر کہا۔ "مگر پھر بھی سوشلزم کا نام کیوں لیا جائے؟"

"نام میں کچھ نہیں رکھا مولانا۔ اسلام کا نام اللہ تعالیٰ کچھ اور رکھتا تو بھی اس کی تعلیمات یہی ہوتیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور اگر آپ کسی جابرانہ نظام کا نام اسلام رکھ لیں تو وہ اسلام نہیں بن جائے گا۔"

"یہ تو بڑی لمبی بحث ہے۔ آپ اصغر خان کے بارے میں بتائیں کہ ان کے سیاست میں آنے سے کیا فرق پڑے گا؟" کوثر نیازی بولا۔

"بھٹو کو گرفتار کر کے ایوب خان نے ظاہر کر دیا ہے کہ وہ بھٹو سے ڈرتے ہیں وہ اصغر خان سے بھی ڈریں گے اور جو آمر اپنے مخالفین سے ڈرنے لگے خواہ وہ کتنا ہی جبر کیوں نہ کرے اور طاقت کا استعمال کتنے ہی بے دریغ انداز میں کیوں نہ کرے اپنے انجام سے نہیں بچ سکتا۔ یہ جنگ دراصل ایوب خاں اور بھٹو کے درمیان نہیں یا ایوب خاں اور اصغر خان کے درمیان نہیں، بلکہ ایوب خان اور

عوام کے درمیان ہے۔ ایوب خان دراصل بھٹو یا اصغر خان سے نہیں ڈرتے بلکہ عوام سے ڈرتے ہیں۔ جب تک عوام حاکم سے ڈرتے رہتے ہیں جبر و استبداد کا نظام قائم رہتا ہے اور جب حاکم عوام سے ڈرنے لگتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ عوام کو زبان مل گئی ہے اور جب عوام کو زبان مل جاتی ہے تو قصرِ شاہی کے در و دیوار ہل جاتے ہیں۔ بھٹو کو میں عوام کی زبان سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اصغر خان بھی عوام زبان بننے کے لئے میدانِ سیاست میں کود رہے ہیں۔"

شاید یہ بحث کچھ دیر اور چلتی مگر ٹیلیفون کی گھنٹی نے سلسلۂ گفتگو توڑ دیا۔ فون مشرق کے دفتر سے آیا تھا اور عنایت اللہ مرحوم کے لئے تھا۔ فون سننے کے بعد عنایت اللہ مرحوم نے بتایا کہ حکومت نے اصغر خان کے بیانات اور اُن کی سیاسی سرگرمیوں کی رپورٹنگ میں سخت احتیاط برتنے کی ہدایت کی ہے۔

"گویا آج اصغر خان پریس کانفرنس میں جو کچھ کہنے والے ہیں وہ شائع نہیں ہو پائے گا۔" میں نے کہا۔ "اب بتایئے مولانا۔ آپ کے سوال کا جواب خود حکومت نے دے دیا ہے۔ جو حکومت اپنی بقا کے لئے اتنی زبردست احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہو وہ آخر کب تک اس طوفان کو روکنے میں کامیاب رہے گی۔ جو بڑی تیزی سے اٹھ رہا ہے۔ ہر سناٹا کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور آج جو سناٹا طاری ہے وہ کل ٹوٹ کر رہے گا۔"

میں نے یہ گفتگو صرف اس لئے درج کی ہے کہ ان احساسات پر روشنی ڈال سکوں جو اس وقت میرے پورے وجود میں موجزن تھے۔ یہ صرف میرے ہی نہیں، میرے ان لاکھوں ہم وطنوں کے احساسات بھی تھے جو ایوبی آمریت کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے سڑکوں پر نکلنے والے تھے۔

اور اسے میں قدرت کی ستم ظریفی ہی کہہ سکتا ہوں کہ جو شخص اس دور میں

بھٹو کو دشمنِ اسلام اور فتنہ پرور قرار دیتا تھا گزشتہ آٹھ برس سے اسے تاریخ اسلام کا رجلِ عظیم ثابت کرتا چلا آرہا ہے اور میں جو اس دور میں بھٹو کو ملتِ پاک کی امنگوں کا نقیب تصور کرتا تھا آج اسکے اِن جرائم کی داستان قلمبند کر رہا ہوں جو اس نے اہلِ پاکستان کے خلاف کئے ہیں۔

○ ○

اس روز اصغر خان نے لاہور میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ایوبی انتظامیہ کے بڑھتے ہوئے آمرانہ رجحانات کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی اور حکومت پر واضح کر دیا کہ عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھنے کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ اصغر خان نے کہا کہ جمہوریت کی آڑ میں آمریت کا جو شرمناک کھیل اتنے عرصے سے جاری ہے اب عوام اسے برداشت نہیں کریں گے اور ایوب خان کو چاہیئے کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو فوری طور پر رہا کر دیں اور خود مستعفی ہو کر ملک کے دونوں بازوؤں کے عوام کی خواہشات کے مطابق حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر حقیقی جمہوری نظام کے قیام کے لئے راہیں ہموار کر دیں۔ اصغر خان نے دوسرے تمام سیاسی قیدیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ بھی کیا جنہیں ایوبی دور کی انتظامیہ نے مختلف مقدمات میں ملوث کر کے جیلوں میں ڈال رکھا تھا۔ اصغر خان کا واضح اشارہ شیخ مجیب الرحمان کی طرف تھا جو اگرتلہ سازش کیس کا ملزم نمبر ایک بن کر اہلِ مشرقی پاکستان کی نظروں میں ایک قومی ہیرو کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔ اصغر خان نے کہا۔

"آمریت نے قائدِ اعظم کے پاکستان کو انسانی حقوق اور اسلامی انصاف کا گہوارہ بنانے کی بجائے ایک وسیع قید خانے کی شکل دے دی ہے جس میں ہر طرف خوف و ہراس، احساسِ عدمِ تحفظ، بے یقینی، محرومی اور بد معاملگی کا

دور دورہ ہے ۔ جو ظاہری سیاسی استحکام ہمیں نظر آرہا ہے۔ یہ قطعی طور پر مصنوعی ہے اس مصنوعی سیاسی استحکام کے نیچے ملک کے مختلف خطوں کے عوام ایک دوسرے کے بارے میں تشکوک وشبہات اور بداعتمادی کا شکار ہورہے ہیں۔ اگر باہمی بداعتمادی اور تشکوک وشبہات کی جڑیں زیادہ گہری ہوگئیں تو اس کے نتائج ملک کے لئے تباہ کن ہوں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان جڑوں کو فوری طور پر اکھاڑ پھینکیں جو صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ملک میں ایسا منصفانہ نظام حکومت قائم کریں کہ ملک کے کسی خطے کے عوام کو یہ شکایت پیدا نہ ہو کہ ان کے ساتھ بے انصافی کی گئی ہے یا انہیں اقتدارِ اعلیٰ میں ان کے حق کے مطابق شریک نہیں کیا گیا۔ ملک کے معاشی اور اخلاقی مسائل بھی صرف اسی طرح حل ہو سکتے ہیں کہ عوام کو اس احساسِ محرومیت سے نجات مِل جائے جو فردِ واحد کی ڈکٹیٹر شپ نے پیدا کیا ہے میں نے قومی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ ملک کو اس ڈکٹیٹر شپ سے اور عوام کو اس احساسِ محرومی سے نجات دلانے کے لئے کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عوام کی جدوجہد بالآخر طاقت کے وہ تمام حصار توڑ دے گی جو آمریت نے اپنی حفاظت کے لئے قائم کئے ہیں"۔

اصغر خاں نے ملک کی صورت حال کا تجزیہ ایک ایسے ذہن سے کیا تھا۔ جو جذبات کو حقائق پر ترجیح دینا چاہتا تھا۔ وہ عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنی مقبولیت کا معیار تعمیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ عوام کو حقائق کی ان تلخیوں سے آگاہ کرنا چاہتے تھے جو ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان سیاسی اقتدار کے عدم توازن کی وجہ سے پیدا ہورہی تھیں۔ سیاسی اقتدار کا یہ عدم توازن اس آمریت کی بدولت قائم ہوا تھا جس کی طاقت کا قلعہ مغربی پاکستان تھا۔ سیاسی اقتدار کے اسی عدم توازن نے مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے بارے میں تشکوک وشبہات اور بداعتمادی کی کی فضا پیدا کر دی تھی اور اصغر خاں کے نزدیک حقیقی سیاسی استحکام اور قومی یک جہتی

کے لئے ضروری تھا کہ حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مشرقی پاکستان کو اقتدار اعلیٰ میں شریک کر کے باہمی شکوک و شبہات اور بداعتمادی کی اس فضا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے جس سے صرف پاکستان کے دشمنوں کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

کاش کہ اصغر خان کو اس وقت معلوم ہوتا کہ جس بھٹو کی حمایت میں وہ میدانِ سیاست میں کود رہے ہیں اس کے منصوبوں میں مشرقی پاکستان کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ کاش کہ اس وقت اصغر خان کو علم ہو جاتا کہ بھٹو کا مقصد جمہوریت کا قیام نہیں، ایوبی حکومت کا خاتمہ ہے۔ تاکہ اس کی ہوسِ اقتدار کی تکمیل کے لئے راستہ صاف ہو سکے۔ کاش کہ اس وقت اصغر خاں یہ جان جاتے کہ جس پاکستان کی سالمیت کے لئے وہ آمریت کے خاتمے اور جمہوریت کے قیام کی جد و جہد شروع کرنے والے ہیں اس پاکستان کی سالمیت ہی بھٹو کے سیاسی عزائم کی راہ میں سب سے بڑی چٹان ہے اور اس چٹان کو ہٹانے کے لئے وہ جمہوریت کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کا منصوبہ تیار کر چکا ہے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ اصغر خان شروع سے ہی بھٹو کو ناپسند کرتے تھے اور ممکن ہے کہ بھٹو کے متعلق کچھ شکوک و شبہات ان کے ذہن میں اس وقت بھی ہوں جب انہوں نے جمہوری نظام کے قیام کے لئے قومی سیاست میں پہلا قدم رکھا، لیکن اس بات کا تصور وہ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ بھٹو اپنی ہوسِ اقتدار کی تکمیل کے لئے پاکستان کی سالمیت تک داؤ پر لگا دے گا۔

اگر میرا مقصد پاکستان کی تاریخ مرتب کرنا ہوتا تو اس عوامی تحریک کے تمام واقعات قلمبند کرتا جس کا آغاز بھٹو نے پشاور سے کیا تھا اور بھٹو کی گرفتاری کے بعد جسے اصغر خان نے ایوبی آمریت کی بنیادیں ہلا دینے والے طوفان کا روپ عطا کر دیا۔ اس تحریک کے دوران اصغر خان اتنے بڑے قومی رہنما کی حیثیت سے ابھرے کہ جو

کچھ بھٹو نے برسوں کی جامع منصوبہ بندی سے حاصل کیا تھا۔ اصغر خاں کو چند ہی دنوں میں حاصل ہو گیا۔ وہ جہاں بھی گئے ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ عوام نے ان پر عقیدت کے پھول نچھاور کئے۔ عوامی حوصلوں کو نیا عزم ملا اور نئی قوت عطا ہوئی بھٹو نے ایجی ٹیشن کے لئے مزدوروں اور طلباء پر مشتمل طاقت کا جو ڈھانچہ تیار کر رکھا تھا وہ ایک دم حرکت میں آگیا۔ جلوسوں اور مظاہروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا اور پولیس امن عامہ قائم رکھنے میں بری طرح ناکام ہونے لگی۔ اصغر خان پر ہاتھ ڈالنا ایوب خاں کے دائرہ اختیار سے باہر نظر آتا تھا۔ ابتداء میں ایوب خاں کو شاید یہ خوش فہمی تھی کہ عوام کے صرف چند طبقات ان کے خلاف ہیں اور باقی عوام اس ترقی و خوش حالی کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں جو ان کے دس سالہ دورِ حکومت میں ہوئی تھی، لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ عوام میں ان کی حمایت تقریباً ختم ہو چکی تھی اور ایک بہت بڑی اکثریت ان کے اقتدار کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے ایک تو یہ کہ ایجی ٹیشن کو کچلنے کے لئے وحشیانہ قوت استعمال کریں اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ رائے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی کوئی باعزت صورت تلاش کریں۔ اگر ایوب خان کی جگہ بھٹو ہوتا تو پہلا راستہ اختیار کرتا اور ملک کے چپے چپے کو "سرکش" عوام کے خون سے نہلا دیتا، لیکن ایوب خان اپنی تمام تر کمزوریوں اور برائیوں کے باوجود محب وطن تھے۔ انہوں نے اپنی ہوسِ اقتدار کو ملک دشمنی کی سرحدوں تک پہنچنے نہ دیا اور قومی سیاست سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔

○ ○

ایوب خان کی وہ تقریر اب بھی میرے ذہن میں گونج رہی ہے جو ریڈیو پر نشر

ہوئی تھی اور جس میں انہوں نے عوام کی خواہشات کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا تھا۔

اس تقریر میں ایوب خان نے کہا۔

"میں نے پورے خلوص کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت کرنے کی کوشش کی میں نے جس نظامِ حکومت کو رائج کیا وہ میرے خیال میں جمہوری بھی تھا اور سیاسی استحکام اور ملکی سالمیت کی ضمانت بھی دیتا تھا۔ لیکن عوامی خواہشات کو پیشِ نظر رکھتے ہوتے ہیں موجودہ آئین میں ایسی تبدیلیاں کرنے کے لئے تیار ہوں۔ کہ آئندہ عام انتخابات حقِ بالغ رائے دہی یعنی ایک فرد۔ ایک ووٹ کی بنیاد پر منعقد کئے جائیں۔ البتہ یہاں میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمیں صدارتی نظام کو ترک نہیں کرنا چاہیئے کیوں کہ یہی نظام میری رائے میں قوم کے بہترین مفادات کے مطابق ہے۔ اس مسئلہ پر میں اپوزیشن کے تمام لیڈروں سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں جو معاملات بات چیت کے ذریعے طے کئے جا سکتے ہیں ان کے لئے ایجی ٹیشن، مظاہروں اور توڑ پھوڑ کا راستہ اختیار کرنا ملک کے مفاد میں نہیں۔ میرا واحد مقصد ملک کو تباہی اور انتشار سے بچانا ہے اور آپ کو اپنے خلوص اور اپنی نیک نیتی کا یقین دلانے کے لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ میں آئندہ عام انتخابات میں حصّہ نہیں لوں گا۔"

یہ ایک ایسے آمر کا اعترافِ شکست تھا جسے اقتدار سے بے پناہ محبت تھی لیکن اتنی ہی محبت اپنے ملک سے بھی تھی وہ تمام نفرتیں جو میرے دل میں ایوبی آمریت کے خلاف پروان چڑھتی رہی تھیں، ایوب خاں کے اس اعترافِ شکست کے سامنے دم توڑ گئیں۔

لیکن بھٹو کے سیاسی عزائم افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔

اصغر خان کی زیرِ قیادت چلنے والی عوامی تحریک کے نتیجے میں بھٹو کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد بھٹو نے پہلا کام یہ کیا کہ ایوب خان کے خلاف اجتماعی قیادت کا حصہ بننے کی بجائے اس نے اپنی پارٹی کو الگ کر دیا۔ اصغر خان کو وہ محض اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ بات اسے گوارہ نہیں تھی کہ اصغر خان کو قومی سیاست میں بالادستی حاصل ہو جائے۔ حالات نے اصغر خان کو اتنے بڑے قد کا قومی لیڈر بنا دیا تھا کہ اب اس قد کو گھٹانے کی ضرورت تھی۔

بھٹو جانتا تھا کہ اگر ایوب خان کو مذاکرات کے ذریعے مسائل حل کرنے کا موقع دیا گیا تو مسائل واقعی حل ہو جائیں گے اور اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لئے اسے جس سیاسی خلا کی ضرورت تھی وہ پیدا نہیں ہو سکے گا۔ یہ سیاسی خلا صرف اس طرح پیدا ہو سکتا تھا کہ ایوب خان فوری طور پر الگ ہو جائیں یا انہیں الگ کر دیا جائے۔

چنانچہ بھٹو نے عوام کے جذبات سے کھیلنے کی پالیسی جاری رکھی اور اصغر خان اور دوسرے اپوزیشن لیڈروں کو بھی مجبور کیا کہ یا تو وہ ایوب خان کے بارے میں نرم رویہ اختیار کر کے اپنی سیاسی موت قبول کر لیں، یا پھر ویسا ہی سخت رویہ اختیار کریں جیسا بھٹو نے اختیار کر رکھا تھا۔

بھٹو کہہ رہا تھا کہ آمریت کے خلاف عوام کی جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ایوب خان کو اقتدار سے الگ ہونے پر مجبور نہیں کر دیا جاتا۔

اور ہم جو بھٹو کو اپنی قومی امنگوں کا نقیب تصور کرتے تھے اس کی باتیں سن کر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آمریت کے خلاف جنگ کو واقعی فیصلہ کن فتح تک جاری رہنا چاہیئے۔ اگر ایوب خان واقعی پُرخلوص ہیں تو وہ فوری طور پر اقتدار سے ہٹنے کے لئے کیوں تیار نہیں۔ ہم یعنی میں اور میرے لاکھوں ہم وطن بھٹو

کی جوشیلی باتوں میں آکر یہ بھول گئے کہ اقتدار کی کرسی خالی نہیں رہ سکتی۔ اگر ایوب خاں فوری طور پر یہ کرسی خالی کردیں تو اسے پُر بھی فوری طور پر کرنا ہوگا اور اسے فوری طور پر پُر کرنے کا کوئی ایسا طریقہ کار نہیں تھا جو آئینی بھی ہو اور عوام کی خواہشات کے مطابق بھی ہو۔

آج جب میں اس دور کا جائزہ لیتا ہوں تو بھٹو کی حکمتِ عملی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مذاکرات کے ذریعے نظامِ حکومت پر اتفاق رائے ہو جائے اور اقتدار کی منتقلی کا آئینی طریقہ طے پا جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو سیاسی بحران اس نے اتنی محنت سے پیدا کیا تھا وہ اس کی ہوسِ اقتدار کے لئے سازگار حالات پیدا کئے بغیر ختم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ایوب خان کی گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا اور یہ پیشگی شرط رکھی کہ شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر کے اسے بھی مذاکرات میں شامل کیا جائے۔ اس کا اندازہ تھا کہ ایوب خان یہ شرط منظور نہیں کریں گے۔ کیوں کہ یہ وہ مسئلہ تھا جس کے بارے میں ایوب خان کے احساسات بڑے شدید تھے۔ لیکن ایوب خان نے ملک کے وسیع تر مفاد کی خاطر اس مسئلے پر بھی اپنی انا کو قربان کر دیا اور شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر کے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے اسلام آباد لایا گیا۔

اگر بھٹو کی جدوجہد جمہوریت کے لئے ہوتی تو بات چیت کے ذریعے جمہوریت کی بحالی کا راستہ پوری طرح ہموار ہو چکا تھا۔ مگر اس کی منزل مسندِ اقتدار تھی اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے ضروری تھا کہ سیاسی بحران کے آئینی حل کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں اور ان جنرلوں کو مداخلت کا بہانہ مل جائے۔ جنہیں اپنے اشاروں پر نچانا بھٹو کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

بھٹو نے سوچا ہوگا۔ "جنرل یحییٰ خان کے اگر اپنے عزائم ہوئے تو بھی مارشل لاء کی حکومت جلد یا بدیر عام انتخابات کرانے پر مجبور ہو جائے گی۔ مغربی پاکستان

میں عوامی طاقت میرے ساتھ ہے اور مشرقی پاکستان میں عوامی طاقت شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ ہے ان دو طاقتوں کا اجتماعی دباؤ یحییٰ خان کو انتخابات کرانے پر مجبور کردے گا اور پھر میں اپنے حامی جنرلوں کی حمایت سے شیخ مجیب الرحمان پر فیصلہ کن برتری حاصل کرلوں گا۔ یہ جنرل اقتدارِ اعلیٰ مشرقی پاکستان کے حوالے کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوں گے اور شیخ مجیب الرحمان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہے گا کہ اسلام آباد کو بھول جائے اور صرف ڈھاکہ پر قناعت کرے"۔

بھٹو کی یہ حکمتِ عملی کامیاب ثابت ہوئی اور اس کی کامیابی نے پاکستان پر تباہی کے دروازے کھول دیئے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیے کے بعد میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس کے شیخ مجیب الرحمان سے بڑے قریبی تعلقات رہ چکے تھے اس شخص نے مجھے بتایا کہ یحییٰ خان کے مارشل لاء کے نفاذ سے قبل شیخ مجیب الرحمان نے خفیہ طور پر ایوب خان سے رابطہ قائم کیا تھا اور انہیں خبردار کیا تھا کہ کچھ جنرل انہیں اقتدار سے ہٹانے کی سازش کر رہے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمان نے ایوب خان کو مشورہ دیا تھا کہ اس سازش کو ناکام بنانے کے لئے وہ حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کرانے کا یک طرفہ طور پر اعلان کردیں۔ شیخ مجیب الرحمان نے یہ یقین دہانی بھی کرائی تھی کہ عوامی لیگ اس اقدام کی مکمل حمایت کرے گی اور ایوب خان کو کسی بھی مخالفت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔

مگر ایوب خان کو اس مشورے پر عمل کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔

مارچ ۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ خان نے مارشل لاء لگا کر اقتدار پر قبضہ کرلیا اور پورے ایک سو چھبیس ماہ تک حکومت کرنے کے بعد ایوب خان افقِ سیاست سے غائب ہوگئے۔

# مجرم کون

صدیاں گزریں حسن بن صباح نے ایک چھوٹی جنت بنائی تھی۔ حسن بن صباح کے جانشین نے کہا۔

" پنجاب کے لوگ تماشبین ہیں۔ انہیں خوش کرنے کے لئے اچھا تماشہ چاہیئے اور میں اتنا اچھا تماشہ پیش کروں گا کہ پنجابی تالیاں بجانے پر مجبور ہو جائیں گے "۔

جنرل یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنی پہلی ہی تقریر میں اعلان کیا کہ وہ حکومت پر قابض رہنے کے لئے نہیں آئے بلکہ ان کا مقصد عام انتخابات کے لئے سازگار حالات پیدا کرنا، سازگار حالات میں عام انتخابات کرانا اور عام انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے والے عوامی نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنا ہے۔

اس امر سے جنرل یحییٰ خان کے بدترین مخالف بھی انکار نہیں کریں گے کہ انہوں نے عام انتخابات کے لئے سازگار حالات پیدا کئے اور سازگار حالات میں تاریخ پاکستان کے پہلے آزادانہ اور منصفانہ عام انتخابات کرائے۔ اگر ان آزادانہ اور منصفانہ عام انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے والے عوامی نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے کا وعدہ پورا کر دیا جاتا تو قائداعظمؒ کے پاکستان کو اپنے مشرقی بازو سے ہاتھ نہ دھونا پڑتے۔ جنرل یحییٰ خان یہ وعدہ اس لئے پورا نہ کر سکے کہ عام انتخابات کے نتائج نے مغربی پاکستان کی قسمت کا مالک بھٹو کو اور مشرقی پاکستان کی قسمت کا مالک شیخ مجیب الرحمان کو بنا دیا تھا۔ اقتدار بھٹو کی پیپلز پارٹی کو اس لئے منتقل نہیں ہو سکتا تھا کہ شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے قومی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل کی تھی اور اقتدار شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ کو اس لئے منتقل نہیں ہو سکتا تھا کہ بھٹو مغربی پاکستان کا لیڈر ہونے کی وجہ سے پیپلز پارٹی کی

اقلیت کو عوامی لیگ کی اکثریت سے زیادہ طاقت ور ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔
عوامی لیگ کے حق اقتدار کو تسلیم نہ کرنے کا مطلب مشرقی پاکستان میں عوامی بغاوت کو دعوت دینا تھا۔ اور پیپلز پارٹی کی طلب اقتدار کو نظرانداز کرنے کا مطلب بھٹو نواز جنرلوں کو دعوتِ بغاوت دینا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں جنرل یحییٰ خان نے پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا۔ اور جو فیصلہ کیا گیا وہ بھٹو کی زبردست سیاسی فتح تھا۔ اسی لئے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کے ذریعے عوام اور عوامی لیگ کو کچل ڈالنے کے فیصلے کو عملی جامہ پہنوانے کے بعد جب بھٹو ڈھاکہ سے مغربی پاکستان پہنچا تو اس نے کراچی کے ہوائی اڈے پر اعلان کیا کہ "خدا نے پاکستان کو بچالیا ہے"۔

اس زمانے میں مجھے اور میرے لاکھوں بھٹو پرست ہم وطنوں کو قدرت نے اس آنکھ سے محروم کر رکھا تھا جو نوشتۂ دیوار پڑھ سکے۔ ہمارے نزدیک بھٹو ٹیپو شہیدؒ، علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے خوابوں کا امین تھا اور شیخ مجیب الرحمان جعفر اور صادق جیسے غداروں کے قبیلے سے تعلق رکھنے والا علیحدگی پسند دشمنِ ملک و ملت تھا۔ ہم یہ تصور کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ بھٹو نے "اِدھر ہم اُدھر تم" کے فلسفے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چند خودغرض اور بے حس جرنلوں کی مدد سے غداری کی تاریخ میں ایک ایسے باب کا اضافہ کیا ہے جس پر کروڑوں فرزندانِ اسلام کی آنکھیں خون کے آنسو روتیں گی۔

لیکن آج جب کروڑوں مسلمانوں کی امنگوں کا یہ قاتل اپنی کھیتی کا پھل کاٹ رہا ہے تو میں ان دلائل کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو بعض بھولے بھالے لوگ مشرقی پاکستان کے متعلق بھٹو کے رویے کی حمایت میں دیتے رہے ہیں۔

ایک دلیل یہ ہے کہ اگر بھٹو قومی اسمبلی کے اجلاس سے پہلے آئینی سمجھوتے

بزورنہ دبایا تو قومی اسمبلی میں عوامی لیگ چھ نکات پر مبنی اپنی مرضی کا آئین قوم پر مسلط کر دیتی جس سے ملک کی سالمیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر بھٹو عوامی لیگ کو برسر اقتدار آنے سے نہ روکتا تو شیخ مجیب الرحمان مغربی پاکستان کی ساری دولت سمیٹ کر مشرقی پاکستان لے جاتا اور جب مغربی پاکستان بالکل مفلوک الحال اور تہی دست ہو جاتا تو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا اعلان کر دیا جاتا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر بھٹو عوامی لیگ کو اقتدار پر قابض ہونے کا موقع دے دیتا تو مشرقی پاکستان کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی علیحدگی پسند قوتیں زور پکڑ جاتیں اور پاکستان کی سرحدیں بالآخر سمٹ کر پنجاب اور سندھ تک محدود ہو جاتیں۔

پہلی دلیل کا جواب تو یہ ہے کہ اگر بھٹو عوامی لیگ کے چھ نکات کو ملکی سالمیت کے خلاف تصور کرتا تھا تو اس نے ایک سچے محب وطن کی حیثیت سے مشرقی پاکستان جاکر عام انتخابات میں عوامی لیگ کا مقابلہ کیوں نہ کیا۔ اس نے اپنا سارا زور مغربی پاکستان پر کیوں صرف کیا اور وہ یہ کیوں بھول گیا کہ مشرقی پاکستان ملک کے باقی چاروں صوبوں کی اجتماعی قوت سے بھی بڑا ہے اور ملک کا جو آئین بنا اسکی تشکیل میں مشرقی پاکستان سے منتخب ہونے والے عوامی نمائندوں کو بنیادی اور فیصلہ کن اہمیت حاصل ہو گی؟ اس نے ملک دشمن چھ نکات والی عوامی لیگ کا زور توڑنے کے لئے مشرقی پاکستان کے عوام کو بھی "روٹی، کپڑا اور مکان" کے بنیادی معاشی نعرے کی گرفت میں لینے کی کوشش کیوں نہ کی اور ملک کی پچپن فیصد آبادی کو "ملک دشمنی پر مبنی چھ نکات" کا نعرہ بلند کرنے والوں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا؟ کیا بھٹو اتنا بے وقوف اور کوتاہ اندیش تھا کہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اگر عوامی لیگ کا

ڈٹ کر مقابلہ نہ کیا گیا تو قومی اسمبلی میں اس چھ نکات والی جماعت کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو جائے گی اور آئین بنانے میں مرکزی کردار ادا کرنے کا حق حاصل کرے گی؟

میرے ان سوالوں کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ بھٹو کو یقین تھا کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور پیپلز پارٹی پورا زور لگا کر بھی عوامی لیگ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ چنانچہ اس نے مشرقی پاکستان کو نظر انداز کر کے حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔ اگر بات حقیقت پسندی پر آتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ جماعت اسلامی بھی تو حقیقت پسندی سے کام لے کر مشرقی پاکستان کو شیخ مجیب الرحمان کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتی تھی۔ جماعت اسلامی نے کیوں انتہائی ناسا عد حالات میں عوامی لیگ کا مقابلہ کیا؟ اگر جماعت اسلامی فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی اجارہ داری کو چیلنج کر سکتی تھی تو پیپلز پارٹی تو عوام کی جماعت تھی۔ اس کے نعروں میں تو دوسری جماعتوں کے نعروں سے کہیں زیادہ کشش تھی۔ کیا ذوالفقار علی بھٹو اتنا محب وطن نہیں تھا کہ فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر صرف اور صرف قومی مفادات کی خاطر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ سے ٹکرا جاتا؟

اور اگر حقیقت پسندی والی بات کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عام انتخابات سے پہلے ہی بھٹو ذہنی طور پر عوامی لیگ کی فیصلہ کن جیت کو تسلیم کر چکا تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ آئین سازی کے کام میں بنیادی اکثریت حاصل کرنے والی عوامی لیگ کی ہوگی۔ عوامی لیگ کو آئین سازی میں بنیادی حیثیت حاصل کرنے سے روکنے کی دو ہی صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اُسے عام انتخابات میں شکست دی جائے اور دوسری یہ کہ عام انتخابات میں عوامی لیگ کی جیت کو یقینی تصور کرتے ہوئے آئین سازی کے بنیادی مسائل کا حل عام انتخابات

سے پہلے ہی تلاش کر لیا جائے اگر بھٹو کو ملکی سالمیت سے ذرا بھی دلچسپی ہوتی تو وہ عام انتخابات میں حصہ لینے سے پہلے مطالبہ کرتا کہ تمام جماعتیں ملک کی آئینی بنیاد پر جب تک سمجھوتہ نہیں کر لیتیں اس وقت تک عام انتخابات منعقد نہ کئے جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ بھٹو کے اس مطالبے کو پوری قوم کی تائید حاصل ہوتی اور اگر عوامی لیگ اس کی مخالفت کرتی تو اس پر واضح کیا جا سکتا تھا کہ آئین کے بارے میں متفقہ سمجھوتے کے بغیر عام انتخابات کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس صورت میں شیخ مجیب الرحمان عام انتخابات میں اپنی یقینی جیت کے پیش نظر چھ نکات پر کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جاتا اور اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کرتا تو ایجی ٹیشن چلانے کے لئے اس کی پوزیشن اس وقت وہ ہرگز نہیں تھی جو اسے عام انتخابات میں فیصلہ کن فتح حاصل کرنے کے بعد عطا ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ محض ایک طاقتور پارٹی کا سربراہ تھا۔ عام انتخابات میں کامیابی کے بعد وہ "بلا شرکت غیر" ملک کی حکومت بنانے اور آئین سازی کے کام میں اکثریت کا فیصلہ نافذ کرنے کا جمہوری اور قانونی حق حاصل کر چکا تھا اس مرحلے پر اس کے اس حق کو چیلنج کرنا جمہوری اقدار کی دھجیاں اڑانے کے مترادف تھا۔ اس مرحلے پر بھٹو کی طرف سے یہ الٹی میٹم دیا جانا جمہوریت کی توہین تھی کہ اگر شیخ مجیب الرحمان نے آئینی مسائل پر پیپلز پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ نہ کیا تو قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد نہیں ہونے دیا جائے گا۔ عام انتخابات سے پہلے شیخ مجیب الرحمان کو الٹی میٹم دیا جا سکتا تھا کہ اگر اس نے آئینی مسائل پر دوسری جماعتوں کے ساتھ سمجھوتہ نہ کیا تو عوامی لیگ کو عام انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ طوفان اس وقت بھی اٹھتا لیکن وہ طوفان اس طوفان جیسا ہرگز نہ ہوتا جو مارچ ۱۹۷۱ء میں عوامی لیگ کے خلاف فوجی کارروائی کے ساتھ اٹھا۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں جس عوامی

لیگ کے خلاف فوجی کارروائی کی گئی وہ پاکستان پر حکومت کرنے کا جمہوری حق حاصل کر چکی تھی اور دنیا بھر کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔

بھٹو نے سب کچھ سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا اسے معلوم تھا کہ عوامی لیگ مشرقی پاکستان میں فیصلہ کن اکثریت حاصل کرے گی۔ وہ چاہتا تھا کہ عوامی لیگ مشرقی پاکستان میں فیصلہ کن اکثریت حاصل کرے تاکہ قومی اسمبلی کے اجلاس سے قبل وہ چھ نکات کا مسئلہ اٹھا کر سیاسی بحران پیدا کر سکے۔ جب یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اعلان کیا تو بھٹو نے اس کا بائیکاٹ کر دیا اور اعلان کیا کہ پہلے شیخ مجیب الرحمٰن پیپلز پارٹی کے ساتھ "اِدھر ہم اُدھر تم" کی بنیاد پر سمجھوتہ کرے۔ اس نے دھمکی دی کہ مغربی پاکستان سے کسی بھی عوامی نمائندے نے ڈھاکہ جا کر قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی تو واپسی پر اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ اسے یقین تھا کہ عوامی لیگ کے انتہا پسند گروپ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر یک طرفہ طور پر حکومت بنانے کا اعلان کر دیں گے اور شیخ مجیب الرحمان بھی پیپلز پارٹی کے ساتھ مذاکرات کرنے کی ذلت سے بچنے کے لئے اپنے انتہا پسند ساتھیوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جاتے گا۔ لیکن شیخ مجیب الرحمان نے بھٹو کی تمام توقعات کے برعکس، ۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو آزادیٔ بنگلہ دیش کا اعلان کرنے کی بجائے صرف سول نافرمانی کی تحریک پر اکتفا کیا اور مذاکرات کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔

مذاکرات میں جو کچھ ہوا اس کا اندازہ بھٹو کے اپنے اعترافِ جرم سے لگایا جا سکتا ہے۔ بھٹو کے ان الفاظ کو کون بھول سکتا ہے کہ "ساڑھے پانچ نکات پر تو سمجھوتہ ہو گیا تھا، لیکن آدھے نکتے کے لئے فوجی کارروائی ضروری ہو گئی"۔ وہ آدھا نکتہ جس کی خاطر بھٹو نے آدھا پاکستان قربان کر دیا آج تک ہیں

معلوم نہیں ہو سکا۔

جنرل یحییٰ خان کے مشیر خاص برائے قانونی امور مسٹر جودھری نے اپنی کتاب "پاکستان کے آخری دن" میں لکھا ہے کہ سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اس سمجھوتے کی روشنی میں شیخ مجیب الرحمان نے منظوری کے لئے جو ڈرافٹ پیش کیا اسے بھٹو کے حامی جنرل پیرزادہ نے مسترد کر دیا۔ اس کے بعد جنرل پیرزادہ نے منظوری کے لئے ایک ڈرافٹ پیش کیا جسے طیش میں آکر شیخ مجیب الرحمان نے مسترد کر دیا۔ المیہ یہ ہے کہ دونوں ڈرافٹ بالکل ایک جیسے تھے۔ اس المیے کی ذمہ داری کا تعین کرتے وقت ہمیں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ پہلے کس نے وہ ڈرافٹ مسترد کیا تھا۔ دوسرے درجے کے ایک جنرل کو اتنے بڑے عوامی لیڈر کی توہین کرنے کی شہ کس نے دی تھی؟

بھٹو کی حمایت میں دی جانے والی سب سے بڑی دلیل کا مفصل جواب دینے کے بعد میں دوسری دلیل کی طرف آتا ہوں جو ایک مفروضے پر مبنی ہے۔ مفروضہ یہ ہے کہ اگر شیخ مجیب الرحمان پاکستان کا وزیر اعظم بن جاتا تو وہ مغربی پاکستان کی ساری دولت مشرقی پاکستان میں منتقل کرنے کے بعد علیحدگی کا اعلان کر دیتا۔

ایک مفروضے کو ایک تباہ کن فیصلے کی بنیاد بنانا یقیناً عقلمندی نہیں۔ اگر اس مفروضے کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بھٹو قومی اسمبلی میں ایک طاقتور اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے شیخ مجیب الرحمان کی غلط کاریوں کے خلاف طوفان نہیں اٹھا سکتا تھا؟ اور اگر بھٹو کی شدید نکتہ چینیوں اور اس کے زبردست احتجاجات کے باوجود شیخ مجیب الرحمان مغربی پاکستان کو مفلوک الحال اور تہی دست بنانے کی پالیسیاں جاری رکھتا تو جس محب وطن فوج نے جنرل پیرزادہ کے اشارے پر ڈھاکہ کو ایک عظیم مقتل بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ محب وطن فوج شیخ

مجیب الرحمان کی "پاکستان دشمنی" کا تماشہ خاموشی سے نہ دیکھتی رہتی۔

بھٹو کے حق میں دی جانے والی تیسری دلیل بھی ایک مفروضے پر مبنی ہے۔ اس مفروضے کے مطابق اگر عوامی لیگ برسراقتدار آجاتی تو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی علیحدگی پسند قوتیں زور پکڑ جاتیں اور پاکستان کی سرحدیں بالآخر سمٹ کر پنجاب اور سندھ تک محدود ہو جاتیں۔ اس مفروضے کا جواب میں بھٹو کے دورِ حکومت کے حوالے سے دینا چاہتا ہوں اور میرا جواب چند سوالوں کی شکل میں ہے۔

۱۔ وہ کون سا صوبہ ہے۔ جس میں بھٹو کے اقتدار کے پہلے ہی سال کے دوران لسانی مسئلہ پیدا ہوا اور اس مسئلے پر خونریز فسادات ہوئے۔

۲۔ وہ کون سا صوبہ ہے جہاں مقامی اور غیر مقامی باشندوں کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ کا ہتھیار استعمال کیا گیا۔؟

۳۔ وہ کون سا صوبہ ہے جہاں ڈومیسائل سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے درخواست دہندہ کو اپنی جائے پیدائش کے ساتھ اپنے باپ کی جائے پیدائش اور باپ کے باپ کی بھی جائے پیدائش ظاہر کرنی پڑتی تھی؟

۴۔ وہ کون سا صوبہ ہے جہاں ایسے درخواست دہندہ کو ڈومیسائل سرٹیفکیٹ جاری نہیں کیا جاتا تھا جس کے باپ اور "باپ کے باپ" کی جائے پیدائش اس صوبے سے باہر ہو۔؟

۵۔ وہ کون سا صوبہ ہے جہاں کسی بھی سرکاری ادارے یا نیم سرکاری ادارے کی ملازمت حاصل کرنے کے لئے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ پیش کرنا لازمی تھا اور اسی بنیاد پر ان ضرورت مندوں پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے جن کے آباؤ اجداد کا تعلق اس صوبے سے نہیں تھا؟

۶۔ وہ کون سا صوبہ ہے جس کے میڈیکل کالجوں میں داخلے کیلئے تھرڈ ڈویژن

حاصل کرنے والے "مقامیوں" کو فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والے غیر مقامیوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ ؟

۷۔ کیا بھٹو کا تعلق اسی صوبے سے نہیں تھا ؟

۸۔ کیا اس صوبے میں بھٹو کی پارٹی کی حکومت قائم نہیں تھی ؟

۹۔ کیا بھٹو کی ہی پارٹی کی حکومت نے وہ لسانی بل پیش نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے اچانک اس صوبے میں لسانی مسئلہ پیدا ہو گیا اور اس مسئلے کی وجہ سے "مقامیوں" اور "غیر مقامیوں" کے درمیان بہت بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔ ؟

میرے ان سوالوں میں بھٹو کی منافقت کی داستان چھپی ہے۔

اگر شیخ مجیب الرحمان کی بنگال پرستی جرم تھی تو بھٹو کی سندھ پرستی کیوں جرم نہیں ؟ اگر عطا اللہ مینگل کی بلوچ پرستی جرم ہے تو بھٹو کی سندھ پرستی کیوں جرم نہیں ؟ اگر ولی خان کی پختون پرستی جرم ہے تو بھٹو کی سندھ پرستی کیوں جرم نہیں ؟ کیا بھٹو صرف اس لئے قابل معافی ہے کہ اسے بھولے بھالے، سیدھے سادے اور بے وقوف پنجابیوں کے جذبات سے کھیلنے کا گُر آتا ہے ؟

بھٹو کے پانچ سالہ دورِ حکومت میں اردو اور پنجابی بولنے والے سندھیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کی ایک مثال میں ذاتی تجربے کی بنیاد پر دے سکتا ہوں۔ میرے ایک بھانجے نے سندھ میں جنم لیا اور سندھ میں ہی پرورش پائی۔ اس نے ۱۹۷۲ء میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ملازمت کے لئے اسے ڈومیسائل کی ضرورت تھی جو اسے چار سال کی اَن تھک کوششوں کے باوجود نہ مل سکا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ اس کے باپ نے سندھ میں جنم نہیں لیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مکمل سندھی ثابت کرنے کے لئے حکام کے سامنے

بہترین سندھی بول کر بھی دکھائی مگر وہ اپنے باپ کی جائے پیدائش بدلنے پر قادر نہیں تھا۔ بالآخر مجھے خود سندھ جانا پڑا اور میرے بھانجے کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے ضلع کا ڈپٹی کمشنر میرا بچپن کا دوست نکلا۔

میں نے ڈومیسائل کے مسئلے پر متعدد "متاثرہ" افراد سے بات چیت کی تو یہ چلا کہ کراچی اور حیدرآباد کا "ڈومیسائل" رکھنے والوں کو ملازمتوں میں قطعی طور پر نظرانداز کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ ان شہروں میں غیر مقامیوں کی اکثریت ہے اور جن علاقوں کے ڈومیسائل کو اہمیت ملتی ہے وہاں غیر مقامیوں کو ڈومیسائل جاری نہیں کیا جاتا۔

یہ اس بھٹو کے اپنے صوبے کا حال تھا جس نے شیخ مجیب الرحمان کو صوبائیت پرست اور علیحدگی پسند قرار دے کر پاکستان کے دو ٹکڑے کرانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔

شیخ مجیب الرحمان پر بھٹو نے یہ الزام بھی لگایا تھا کہ وہ ہندوؤں کے ہاتھوں میں کھیلتا تھا اور خود بھٹو نے اپنے دورِ حکومت میں سندھ کے ہندوؤں کو کس فیاضی کے ساتھ نوازا اس کا اندازہ اس خراجِ تحسین سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے رانا چندر سنگھ کو ادا کیا۔

بھٹو نے رانا چندر سنگھ اور اس کے خاندان کی شاندار "قومی" خدمات کا ذکر کرتے ہوتے کہا۔

"ہم یہ بات کیسے فراموش کر سکتے ہیں کہ رانا چندر سنگھ کے آبا و اجداد نے ہمارے آباؤ اجداد کو پناہ دی تھی۔"

بھٹو کا اشارہ ہمایوں کی طرف تھا جو افغانوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد عمر کوٹ میں آکر پناہ گزین ہوا تھا۔ لیکن کتنی شرمناک بات ہے کہ رانا چندر سنگھ کی تعریف کرنے کے جوش میں بھٹو بھول گیا کہ ہمایوں کو راجپوتوں نے

پناہ اس لئے دی تھی کہ اسے شکست دینے والے شیر شاہ سوری کو ہندو اپنے لئے حقیقی خطرہ سمجھتے تھے۔

○ ○
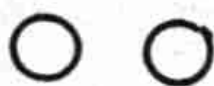
میں بہت آگے نکل آیا ہوں اور میں نے ان انتخابات کا جائزہ نہیں لیا۔ جن کے نتائج نے مغربی پاکستان کو بھٹو کی طاقت کا قلعہ بنا دیا۔

جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء نے پاکستان میں جو سیاسی خلاء پیدا کیا اس نے بھٹو کو وہ حالات فراہم کر دیئے جن کی اسے ضرورت تھی وہ سیاست دان جو دورِ ایوبی سے پہلے عوام کی نظروں سے گر چکے تھے اور جنہوں نے دورِ ایوبی کے دوران بھی عوامی مسائل کے ساتھ حقیقی ہم آہنگی پیدا نہیں کی تھی۔ ان کے سیاسی وجود کو ختم کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ ان سیاست دانوں کا کوئی عوامی امیج نہیں تھا۔ کیونکہ ان کی ساری سیاست "مذاکرات، جوڑ توڑ اور محلاتی سازشوں" کے ارد گرد گھومتی رہی تھی۔ انہوں نے کبھی عوام کے اندر آنے اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ان میں کچھ تو اپنی اپنی "برادریوں" کی قوت پر بھروسہ کرتے تھے اور کچھ کو اپنی جاگیروں اور دولت مندی پر اندھا اعتماد تھا۔ ان کے خیال میں یہی باتیں "پیشہ ورانہ سیاست" میں بنیادی اہمیت رکھتی تھیں۔ کچھ روایتی قسم کے نعرے بھی انہوں نے اپنا رکھے تھے جو ان کے اندازوں کے مطابق عوام کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھے۔

مثلاً۔ ہم کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کی پرجوش حمایت کرتے ہیں۔ ہم عوام کے سچے خادم ہیں اور برسرِ اقتدار آنے کے بعد ملک و قوم کی بے لوث خدمت کریں گے۔ ہم قائد اعظم کے بتائے ہوئے اصولوں یعنی اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کو زندہ رکھیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان سیاست دانوں کو یقین تھا کہ وہ اس قسم کی باتیں کر کے مطلوبہ ووٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ ووٹ حاصل کرنے کے لئے وہ اپنی دولت کا سہارا بھی لے سکتے ہیں اور ذات برادری کا چکر بھی چلا سکتے ہیں۔ یہ سیاست دان زیادہ تر مسلم لیگ اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والی متعدد مسلم لیگوں اور دوسری جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان پیشہ ور سیاست دانوں کا نشۂ سیاست ہرن کرنا اس بھٹو کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا جو ووٹ کے بدلے میں عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان دینے کا وعدہ کر رہا تھا، جو فیکٹریوں اور کارخانوں کو خود غرض اور مغرور سرمایہ داروں سے چھین کر خون اور پسینہ ایک کر دینے والے مزدوروں کے حوالے کر دینے کا بیڑہ اٹھاتے ہوئے تھا، جو زمینیں ظالم جاگیرداروں، زمین داروں اور وڈیروں سے چھین کر ملک کے غریب محنتی، مستحق اور مظلوم مزارعوں اور کسانوں میں تقسیم کا پختہ ارادہ ظاہر کر رہا تھا اور جو تہیہ کر چکا تھا کہ امیروں کی ساری دولت ان سے چھین کر ملک کے غریب عوام میں بانٹ دی جائے گی۔

گھسے پٹے نعرے استعمال کرنے والے پیشہ ور سیاست دانوں سے بھٹو کو یقیناً کوئی خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ اصغر خاں سے ہو سکتا تھا، لیکن وہ عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کرنے کے بعد اپنی قائم کردہ جسٹس پارٹی توڑ چکے تھے اور یوں ان کے پاس اب کوئی ایسا طاقتور سیاسی پلیٹ فارم نہیں تھا۔ جہاں سے بھٹو کے چیلنج کا موثر جواب دیا جا سکتا۔ اس روز بھٹو نے یقیناً گھی کے چراغ جلاتے ہوں گے۔ جب اصغر خاں نے پیشہ ور سیاست دانوں کی باتوں میں آکر جمہوری مزاج رکھنے والی مختلف جماعتوں کے اشتراک سے ایک طاقتور سیاسی پارٹی کے قیام کی خاطر اپنی سیاسی طاقت کے حصار یعنی جسٹس پارٹی کو خود ہی ختم کر دیا۔ اصغر خاں کے اس فیصلے کا تفصیلی تجزیہ میں آنے والے ابواب میں کروں گا۔ یہاں میں صرف اس سیاسی

فضا کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ جس میں ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات ہوئے۔

صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھٹو کا مقابلہ جن گروہوں اور لیڈروں سے تھا وہ اپنے علاقوں کے عوام کے جذبات کو اپیل کرنے والے نعروں کو بہتر طور پر استعمال کرنے کی پوزیشن میں تھے، لیکن مغربی پاکستان میں سیاسی طاقت کا توازن پنجاب اور سندھ کے ہاتھ میں تھا اور ان صوبوں کے عوام کو اپنے پیچھے لگا کر بھٹو پورے مغربی پاکستان کی قسمت کا مالک بننے کی پوزیشن میں تھا۔

جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے تو ملک کے اس بازو کے عوام اپنی امنگوں کی مشعل شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ کے ہاتھ میں دے چکے تھے۔ مگر مستقبل کے جس پاکستان پر بھٹو حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا اس کے نقشے میں مشرقی پاکستان کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ سے بھی اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

اقتدار کی کرسی تک پہنچنے کے لئے بھٹو کو صرف پنجاب اور سندھ میں بھاری اکثریت سے عام انتخابات جیتنے کی ضرورت تھی اور ان دو صوبوں میں اس کا حقیقی مقابلہ "اسلام خطرے میں ہے" کے نعرے سے تھا۔ جسے مذہبی جماعتوں نے بلند کیا تھا۔ ان مذہبی جماعتوں میں سب سے زیادہ طاقتور جماعت اسلامی تھی اور اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۷۰ء کی انتخابی جنگ بنیادی طور پر پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی کے درمیان لڑی گئی۔ کیونکہ بھٹو کی مخالف دوسری تمام قوتوں نے بھی "اسلام خطرے میں ہے" کے نعرے کو ہی اپنی انتخابی مہم کی تھیم بنایا۔ ان "قوتوں" میں وہ تمام پیشہ ور سیاست دان بھی شامل تھے جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ قومی سیاست میں بھٹو کا ظہور ان سیاست دانوں کی اجارہ داری کے لئے خطرہ بن چکا تھا اس لئے انہوں نے بھی "اسلام خطرے میں ہے" کے نعرے تلے جمع ہونے میں ہی اپنی بقا تصور کی۔

اس نعرے کو غیر مؤثر بنانا بھٹو کے لئے قطعاً مشکل نہیں تھا۔ بھٹو نے اپنے منشور میں بھی "اسلام ہمارا دین ہے" کا نعرہ شامل کر رکھا تھا اور انتخابی مہم میں اسے بس یہ ثابت کرنا تھا کہ "اگر غریب کو روٹی، کپڑا اور مکان مل جائے تو اسلام کو ہرگز کوئی خطرہ پیش نہیں آ سکتا۔ اگر دولت مند طبقے کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہونے والے غریب عوام کو دولت مندوں کی برابری کرنے کا حق مل جائے، اگر بڑے بڑے جاگیرداروں کی زمینیں چھین کر غریب مزارعوں اور کسانوں میں تقسیم کر دی جائیں اور اگر کارخانوں اور فیکٹریوں وغیرہ کو سرمایہ داروں سے حاصل کر کے مزدوروں کی تحویل میں دے دیا جائے تو اسلام کسی طرح بھی خطرے میں نہیں پڑے گا۔"

بھٹو کے یہ نعرے کس حد تک قابلِ عمل تھے اور ان نعروں کے ساتھ وہ کس حد تک پُرخلوص تھا یہ ایک الگ بحث ہے۔ یہاں میں صرف بتانا چاہتا ہوں کہ بھٹو ان نعروں کے ذریعے ان کروڑوں عوام کی ناآسودہ خواہشات اور امنگوں کو زبان دے رہا تھا جو بے حس حاکم طبقات کی وحشیانہ ہوسِ زر کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ ان مجبور اور بے بس عوام کو بھٹو کے نعروں میں امید کی ایک ایسی کرن نظر آئی جس سے وہ کسی قیمت پر بھی نظریں ہٹانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ جب ان عوام کے کانوں سے ٹکراتا تو وہ سوچے بغیر نہ رہتے کہ اسلام کی آڑ میں "غریبوں کے ہمدرد اور دولت مندوں کے دشمن بھٹو" کو ناکام بنانے کی سازش کی جا رہی ہے۔

بھٹو کا ہاتھ غریبوں کی نبض پر تھا۔

وہ اسلام سے عوام کے جذباتی لگاؤ کو بھی ایکسپلائٹ کر رہا تھا اور عوام کے معاشی مسائل کو سوشلزم کے ذریعے حل کرنے کا عہد بھی کر رہا تھا۔ جماعت اسلامی کا کہنا تھا کہ سوشلزم ایک ملحدانہ تصور ہے اور اسلامی نظام کی موجودگی میں سوشلزم کا

نام لینا کفر ہے۔ بھٹو کا جواب یہ تھا کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جس میں عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرنے والا سوشلزم بھی موجود ہے۔ جماعت اسلامی کا موقف یہ تھا کہ رازق تو خدا ہے۔ بھٹو کون ہے روٹی، کپڑا اور مکان دینے والا؟ بھٹو کا موقف یہ تھا کہ دولت کے اصل مالک غریب عوام ہیں۔ اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے اس دولت کو ناجائز طور پر اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔ جماعت اسلامی کہہ رہی تھی کہ روٹی، کپڑے اور مکان وغیرہ کے چکر میں آنے سے ایمان کمزور ہو جاتا ہے اور بھٹو کہہ رہا تھا کہ وہ جس سوشلزم کی بات کر رہا ہے وہ دراصل مساواتِ محمدیؐ ہے اور مساوات محمدیؐ نافذ کر کے اگر غریب عوام کو ملک کی دولت کا مالک بنا دیا جائے تو یہ ایمان کی کمزوری نہیں

اس پروپیگنڈے اور جوابی پروپیگنڈے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے مساواتِ محمدیؐ نافذ کرنے کا دعویٰ کرنے والے لوگ خود بھی سرمایہ دار اور جاگیردار تھے۔ عوام ان کے پروپیگنڈے سے اس لئے متاثر ہوئے کہ انہیں اپنی غربت دور کرنے کے لئے امید کی کسی کرن کی ضرورت تھی اور یہ کرن انہیں ان لوگوں کے پروپیگنڈے میں نظر نہیں آ رہی تھی جو نجی ملکیت اور ارتکازِ زر کے نظام کو سہارا دینے کے لئے اسلام کا نام استعمال کر رہے تھے۔ عوام کو پورا پورا یقین تھا کہ اگر بھٹو نے برسر اقتدار آ کر ان کی غربت دور کر دی تو وہ پھر بھی مسلمان ہی رہیں گے اور ان کے ایمان میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہو گی۔

جماعت اسلامی جس قسم کے اسلامی نظام کے تحفظ کے لئے جہاد کر رہی تھی اس نے بھٹو کی پوزیشن مضبوط سے مضبوط تر کر دی۔ صورت حال کچھ اس طرح کی ہو گئی کہ اس زمانے میں جو شخص بھی اسلام کا نام لیتا اسے سرمایہ دارانہ نظام اور

امریکی سامراج کا ایجنٹ قرار دے دیا جاتا۔ اس صورت حال کو پروان چڑھانے کا سہرا جماعت اسلامی کے سر تھا۔

مجھے یاد ہے۔ ایک دن میں ٹیکسی میں دفتر جا رہا تھا۔ انتخابی گہما گہمی زوروں پر تھی میں ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھ بیٹھا کہ "جناب آپ کس پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں"؟

اس نے جواباً پوچھا۔ "پہلے آپ بتائیے کہ آپ کس پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں"؟

"میں تو مسلمان ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔

ٹیکسی ڈرائیور ایک دم بھڑک اٹھا اور بولا۔ "کیا صرف جماعت اسلامی والے مسلمان ہیں۔ ہم مسلمان نہیں ہیں؟ اگر ہم غریبوں کو عزت سے جینے کا حق مل جائے تو آپ لوگوں کا کیا بگڑے گا"؟

اس ٹیکسی ڈرائیور کے جذبات میں مجھے آنے والے انتخابات کے نتائج پوری طرح نظر آ گئے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

"برادرم ہم سب مسلمان ہیں اور ہم سب کو عزت کے ساتھ جینے کا حق ہے۔ یہ حق ہم ان لوگوں سے ضرور حاصل کریں گے جو دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے کے حق کو اسلام کا نام دے رہے ہیں"۔

انتخابات سے پہلے میں نے جماعت اسلامی کے ایک ہمنوا کے ساتھ شرط لگائی کہ جماعت اسلامی قومی اسمبلی میں زیادہ سے زیادہ پانچ نشستیں حاصل کر سکے گی۔ وہ شخص میری اس "احمقانہ پیشگوئی" پر خوب دل کھول کر ہنسا مگر میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ جس کشمکش کو یہ لوگ کفر و اسلام کا معرکہ قرار دے رہے ہیں وہ عوام کی نظروں میں دو نظاموں کے درمیان مقابلہ ہے۔ ایک نظام کے علمبردار غریبوں کو اپنی غربت پر قناعت کرنے اور خدا کا شکر ادا کرتے رہنے کا درس دے رہے ہیں اور دوسرے نظام کے داعی غریبوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ غربت ان کی تقدیر نہیں اور

جس دولت پر مٹھی بھر لوگوں نے ناجائز ہتھکنڈوں کے ذریعے قبضہ جما رکھا ہے اس پر غریب عوام کا بھی حق ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر غریبوں کو یہ بتایا جاتا کہ اسلام بنیادی طور پر غریبوں کا مذہب ہے اور اس میں حصولِ دولت اور ارتکازِ زر کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تو بھٹو کے نعروں کی کشش زائل کی جا سکتی تھی۔ لیکن "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ لگانے والے لوگ اپنا زور یہ ثابت کرنے پر صرف کر رہے تھے کہ جائز ذرائع سے دولت کمانا اسلام میں ناجائز نہیں۔ یہ لوگ بھول گئے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غربت اور سادگی کو امارت اور آرام پر ترجیح دی تھی۔ حالانکہ اگر آپؐ چاہتے تو جائز ذرائع سے دولت کما کر اپنے آپ کو غریبوں کی صف سے نکال لیتے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی ساری زندگی غربت سے قریب اور امارت سے دور رہ کر گزاری۔؟ صرف اس لئے کہ آپؐ جانتے تھے کہ غریبوں کی تعداد امیروں سے کہیں زیادہ تھی اور آپؐ چاہتے تھے کہ ایسی زندگی بسر کریں جیسی زندگی تمام لوگ بسر کر سکیں۔ آپؐ نے عملی زندگی کے ذریعے مسلمانوں کو تعلیم دی کہ حرصِ دولت بری چیز ہے اور انسان کو صرف اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ طبقاتی کش مکش اس معاشرے میں پیدا ہوتی ہے۔ جس کا ایک طبقہ اپنی آمدنی کے ذرائع بڑھاتا چلا جائے اور دوسرا طبقہ آمدنی کے مواقع سے بھی محروم رہے۔ رسولِ مقبولؐ اسلام کے ذریعے اس طبقاتی کش مکش کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ کے اس مشن کو حضرت صدیق اکبرؓ نے، حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت علیؓ اور حضرتِ ابوذر غفاریؓ جیسی جلیل القدر شخصیتوں نے جاری رکھا۔ ان میں سے کوئی بھی طبقۂ امرا سے تعلق نہیں رکھتا تھا اور ان میں سے کسی کو "جائز" ذرائع سے دولت کمانے میں دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے فاروق اعظمؓ کے وہ الفاظ یاد آ رہے ہیں۔ جو انہوں نے گورنر مصر

عمرو العاص کو ایک خط میں لکھے تھے۔

"عاص کے بیٹے میں نے تمہیں مصر کا گورنر مقرر کیا۔ اس لئے کہ تم عملی زندگی سے کفار پر اسلام کی فضیلت ظاہر کرو۔ مگر یہ معلوم کر کے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے کہ تم نے اپنے لئے اتنی ساری دولت جمع کر لی ہے اور تم عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ تم کہتے ہو کہ تم نے یہ ساری دولت جائز ذرائع سے حاصل کی ہے اور تم نے جو حساب کتاب بھیجا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے کوئی بددیانتی نہیں کی، لیکن میں یہ کیسے مان لوں کہ کوئی مسلمان اتنا امیر بن سکتا ہے، تمہیں صرف اتنی دولت حاصل کرنیکا حق تھا جتنی دولت کی تمہیں ضرورت تھی۔ باقی ساری دولت پر ان لوگوں کا حق ہے۔ جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس لئے میرا تمہیں مشورہ ہے کہ تمام فاضل دولت بیت المال میں جمع کرا دو۔ اسی میں تمہاری فلاح ہے۔ اگر تم نے میرے اس مشورے پر عمل نہ کیا تو خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے میں تمہیں مجبور کروں گا کہ تمہارے پاس صرف اتنی ہی دولت رہے جتنی دولت کی تمہیں ضرورت ہے۔"

یہ ہے اس اسلام کی روح جو رحمت اللعالمین نے بنی نوع انسان کی اجتماعی فلاح کے لئے رائج کیا تھا۔ جس اسلام کو بھٹو نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں شکست دی وہ فاروق اعظمؓ کا اسلام نہیں عمرو العاص کا اسلام تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ بھٹو فاروق اعظمؓ کا اسلام نافذ کرنا چاہتا تھا۔ بھٹو کا کا واحد مقصد عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنے لئے اقتدار کا راستہ صاف کرنا تھا۔ وہ طبقاتی کشمکش کو صرف اس لئے ہوا دے رہا تھا کہ غریب عوام کی اکثریت اپنی محرومیوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے اسے ووٹ دے۔ المیہ یہ ہے کہ مجھ جیسے پڑھے لکھے لوگ بھی اس عظیم فراڈ اور دھوکے کا شکار ہو گئے۔ ہم

بھول گئے تھے کہ ایک بدکردار جاگیردار کسی ایسے انقلاب کا سچا داعی نہیں ہو سکتا جو غریب طبقے کو امیر طبقے پر بالادستی عطا کر دے ہم نے یہ نہ سوچا کہ بھٹو طبقاتی کشمکش کی آڑ میں معاشرے کو ایسی افراتفری اور ایسے انتشار کا شکار بنا رہا ہے۔ جس سے وہ بوقت ضرورت پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔

کئی صدیاں گزریں دنیائے اسلام میں ایک جھوٹا پیغمبر پیدا ہوا تھا۔ جس کا نام حسن بن صباح تھا۔ بھولے بھالے مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے اس نے ایک جھوٹی جنت بنائی تھی۔ حسن بن صباح کے کارندے اس جھوٹی جنت کا نقشہ کچھ اتنی عمدگی کے ساتھ کھینچتے تھے کہ بے شمار لوگ اس کی تمنا میں صراط مستقیم سے بھٹک کر حسن بن صباح کے پیروکار بن گئے۔ حسن بن صباح کا کمال یہ تھا کہ جو بھی اس کا پیروکار بنتا بس اسی کا ہو کر رہ جاتا۔ اس کی اداکاری اتنی عمدہ تھی اور اس کی شخصیت کا سحر اتنا گہرا تھا کہ اس کے بدترین جرائم کو بھی اس کے عقیدتمند عقیدت اور صرف عقیدت کی نظر سے دیکھتے تھے وہ حسن بن صباح کی جھوٹی جنت میں داخل ہونے کے لئے خود بھی سنگین سے سنگین جرم کا ارتکاب کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

بھٹو مجھے حسن بن صباح کی یاد دلاتا ہے۔

حسن بن صباح جھوٹا پیغمبر تھا اور اس نے ایک جھوٹی جنت کا جال پھیلایا تھا۔

بھٹو جھوٹا پیغمبر تو نہیں جھوٹ کا پیغمبر ضرور ہے اس نے جس جھوٹی جنت کا جال پھیلایا اس کے خواہشمند آج بھی اس سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔

یہی جھوٹی جنت ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں بھٹو کی فقیدالمثال کامیابی کی وجہ بنی۔ اس کامیابی کا گڑھ پنجاب تھا۔ جس کے بارے میں بھٹو نے اپنے ایک معتمد خاص سے کہا تھا۔

"پنجاب کے لوگ تماشبین ہیں۔ انہیں خوش کرنے کے لئے اچھا تماشا چاہیئے اور میں اتنا اچھا تماشہ پیش کروں گا کہ پنجابی تالیاں بجانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

اور پنجابیوں نے جی کھول کر بھٹو کے لئے تالیاں بجائیں۔

ایک جلسہ عام میں بھٹو نے کہا۔

"یہ اسلام پسند جو غریب عوام کے دشمن ہیں مجھ پر الزام لگاتے ہیں کہ میں شراب پیتا ہوں، ہاں میں شراب پیتا ہوں۔ غریبوں کا خون تو نہیں پیتا۔"

اس بات پر زندہ دلانِ پنجاب نے خوب تالیاں بجائیں اور ان تالیوں کی گونج میں بھٹو اقتدار کی منزل کی طرف بڑھتا گیا۔

---

# خُون کے آنسُو

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے
دوران مسلم تاریخ میں جرأت و
شجاعت کی نئی داستانوں
کا اضافہ کرنے والی فوج کے
ناقابلِ تسخیر ہونے کا جو قوی
یقین پوری قوم کو تھا۔ اسے
پاش پاش کئے بغیر بھٹو
بلا شرکتِ غیر اس کُرسی پر
نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ جس
کی خاطر اس نے اتنے جھوٹ
بولے تھے، اتنے ناٹک رچائے
تھے اور اتنے بہروپ اختیار
کئے تھے۔

۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو جب مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف بھٹو کے حامی جرنلوں نے فوجی کارروائی کی تو بہت کم لوگوں کو احساس تھا کہ اس اقدام سے بھٹو کا پاکستان تو اس کے اقتدار کا قلعہ بننے کے لئے بچ گیا ہے، لیکن قائداعظمؒ کے پاکستان کے زندہ رہنے کی آخری امید بھی ختم ہوگئی ہے۔ وہ شیخ مجیب الرحمان جسے ہم غدار قرار دیا کرتے تھے اس کے قومی کردار کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ ڈھاکہ سے راہ فرار اختیار کرنے پر اپنے گھر میں سنگینوں اور بندوقوں کا انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ جو کچھ ہوا تھا جو کچھ ہونے والا تھا وہ سارے پاکستان کی شکست تھی۔ حتیٰ کہ علیحدگی پسندی اور غداری کے ملزم شیخ مجیب الرحمان کی بھی شکست تھی۔ فتح صرف ایک شخص کی تھی کامران صرف ایک شخص ہوا تھا اور اس شخص کا نام ذوالفقار علی بھٹو تھا۔

لیکن اس وقت ہم سب "ملکی سالمیت" کے دشمن شیخ مجیب الرحمان اور اس کی عوامی لیگ کو ایسا سبق سکھانے کے موڈ میں تھے کہ پھر کوئی ماں کا لال چھ نکات کی بات کرنے کا حوصلہ پیدا نہ کر سکے۔ صرف ایک لیڈر ایسا تھا جس نے اس وقت اہلِ پنجاب کے موڈ کی پرواہ کئے بغیر زبانِ ہوش سے بات کرنے کی جرأت دکھائی۔ اُس نے کہا مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی نے پاکستان کی سالمیت کو ناقابلِ تلافی نقصان

پہنچایا ہے۔ وہاں کے عوام پر چلنے والی ہر گولی سالمیت وطن میں چھید ڈال رہی ہے اب بھی وقت ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کو ان کا وہ حق دے دیا جائے جو انہوں نے عام انتخابات میں حاصل کیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو میری نظریں پاکستان کے نقشے کو دو حصوں میں تقسیم ہوتا دیکھ رہی ہیں"۔

یہ صدائے ہوش اصغر خان کی تھی جن پر اس وقت گندے انڈوں اور ٹماٹروں کی بارش کی گئی۔

بھٹو ان حالات کا جائزہ بڑی فاتحانہ نظروں سے لے رہا تھا۔ جس پاکستان کو بچانے کے لئے اس نے قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد نہیں ہونے دیا تھا۔ اس پاکستان کو بچانے کے لئے اب ٹکا خان کے ٹینک حرکت میں آچکے تھے۔ یہ وہی ٹینک تھے جن سے بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ لڑی جانی تھی۔ بھارت ان ٹینکوں کی زد سے دور تھا۔ مشرقی پاکستان کے عوام ان ٹینکوں کی زد میں تھے۔ جنرل ٹکا خاں پاکستان کی سالمیت کو بچانے کے جذبے سے اس قدر سرشار تھے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا۔ "مجھے عوام نہیں چاہئیں۔ زمین چاہیئے۔ جس کا نام پاکستان ہو"۔

یہی جنرل ٹکا خان بعد میں بھٹو کے دست راست بنے۔ انہوں نے ہی اس سال بھٹو استبداد کے خلاف چلنے والی عوامی تحریک کو کچلنے کے لئے کہا۔ "دس بیس ہزار افراد کو اگر ختم بھی کرنا پڑے تو کوئی بری بات نہیں"۔

یہ بھٹو کی خوش قسمتی تھی کہ مشرقی پاکستان کے عوام کا مزاج درست کرنے کی ذمہ داری ٹکا خاں جیسے سفاک محب وطن کے سپرد کی گئی تھی۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں ٹکا خان نے بندوق اور گولی کا استعمال اتنی فیاضی کے ساتھ کیا کہ مشرقی پاکستان کے عوام کو یقین ہو گیا کہ وہ پاکستان کے شہری نہیں پاکستان کی ایک نوآبادی کے شہری ہیں جس پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے پاکستان کی افواج نے اپنی توپوں

کے دہانے کھول دیتے ہیں۔

جنرل یحییٰ خان کو بہت دیر کے بعد احساس ہوا کہ فوجی کارروائی نے اہل مشرقی پاکستان کے حوصلوں کو پست کرنے کی بجائے آزادی کی ناقابل تسخیر تڑپ اور تمنا میں بدل دیا ہے۔ حالات کو سنبھالنے کے لئے جنرل ٹکا خاں کو واپس بلا لیا گیا اور مشرقی کمان جنرل نیازی کے سپرد کر دی گئی۔ عام معافی کا اعلان بھی کیا گیا اور سیاسی تصفیہ کے لئے نئی راہیں بھی کھولی گئیں۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ بھارت نے "مظلوم" مشرقی پاکستانیوں کے لئے اپنی سرحدیں کھول دی تھیں اور پھر خود ہی بین الاقوامی سطح پر یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا کہ پاکستان کے فوجی حکمران ہندوؤں کو بھارت میں دھکیل رہے ہیں جس کی وجہ سے بھارتی حکومت زبردست مسائل کا شکار ہو گئی ہے۔ ان "زبردست مسائل" کو حل کرنے کے لئے بھارت نے اپنی سرحدوں پر گوریلا جنگ کی تربیت کے لئے جو بے شمار مراکز قائم کئے ان کی باگ ڈور بھارتی فوج کے ہاتھوں میں تھی۔ "پاکستانی" غاصبوں" کو بنگلہ دیش سے نکالنے کے لئے جو مکتی باہنی قائم ہوئی اس میں مشرقی پاکستانیوں سے کہیں زیادہ تعداد بھارتی فوجیوں کی تھی۔ پاکستان کی سالمیت پر کاری وار کرنے کا جو خواب بھارت برسہا برس سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تعبیر کی راہیں بھٹو کی ہوسِ اقتدار نے ہموار کر دی تھیں۔

اب جنرل یحییٰ خان مکمل طور پر بھٹو کے عزائم کا قیدی بن چکا تھا۔ اس وقت بھی اگر ہوش مندی، دور اندیشی اور حقیقت پسندی سے کام لیا جاتا تو اس تباہی اور شکست و ریخت کو ٹالنے کا کوئی راستہ تلاش کیا جا سکتا تھا جس کی ظلمت بھری گھٹائیں بڑی تیزی کے ساتھ پاکستان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ لیکن بھٹو کا مفاد اس بات میں تھا کہ ہوش پر جوش غالب آ جائے۔ چنانچہ جب جنرل یحییٰ خان نے اسے چینی لیڈروں کے خیالات معلوم کرنے کے لئے پیکنگ بھیجا تو واپس آ کر اس

اعلان کیا۔ "اگر بھارت نے مشرقی پاکستان کے تخریب کاروں کو امداد فراہم کرنے پالیسی جاری رکھی تو پھر دما دم مست قلندر۔ جنگ ہو گی اور اس جنگ میں چین عملی طور پر ہماری امداد کرے گا۔"

اہل پنجاب کے لئے جنگ کے نعرے میں جو کشش تھی اس کا اندازہ بھٹو سے زیادہ کسے ہو سکتا تھا۔ اہل پنجاب کے لئے پاک بھارت جنگ کا درجہ حق و باطل کی جنگ جیسا تھا اور بھٹو جانتا تھا کہ بھارت کے ساتھ جنگ کے ہر موقع کو اہلِ پنجاب باطل پر حق کی فیصلہ کن برتری ثابت کرنے کا موقع قرار دیں گے! اہلِ پنجاب کی اسی نفسیات سے کھیلتے ہوئے بھٹو نے دما دم مست قلندر کا نعرہ لگایا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں جنرل یحییٰ خاں عوامی لیگ کے ساتھ مذاکرات کرنے کا کوئی راستہ نہ تلاش کرلیں۔ اس قسم کے ہر امکان کو روکنے کے لئے وہ اہلِ پنجاب کے عسکری جذبات کو پوری شدت کے ساتھ ابھارنا ضروری سمجھتا تھا۔ اسے جنرل پیرزادہ کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ جنرل یحییٰ خان امریکہ کی وساطت سے کلکتہ میں مقیم جلاوطن عوامی لیگ کی حکومت کے ارکان سے خفیہ روابط قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھٹو امریکی مفادات کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اس لئے وہ سمجھتا تھا کہ عوامی لیگ کے ساتھ جنرل یحییٰ خاں کی مصالحت امریکہ کے بہترین مفاد میں تھی حالات نے عوامی لیگ کو امریکہ کے دائرۂ اثر و رسوخ سے نکال کر سوویت یونین کی گود میں پھینک دیا تھا۔ اب امریکہ ان حالات کو بدلنے کے لئے کسی ایسے فارمولے کی تلاش میں تھا جو جنرل یحییٰ خان کے لئے قابلِ عمل اور عوامی لیگ کے لئے قابلِ قبول ہو۔

بھٹو نے اس صورت حال کا توڑ جنگ کا نعرہ لگا کر کیا۔ ساتھ ہی اس نے یہ جھوٹ بھی بولا کہ چین اس جنگ میں پاکستان کی عملی امداد کرے گا۔ یہ ایک ایسا

جھوٹ تھا جس کی تردید چینی حکومت علانیہ طور پر نہیں کر سکتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ چینی لیڈروں نے بھٹو پر واضح کر دیا تھا کہ جنگ کے خطرے کو ٹالنے میں ہی پاکستان کا بہترین مفاد ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب ماؤزے تنگ کا چین اپنی تیئس سالہ تاریخ کے بدترین سیاسی بحران سے گزر رہا تھا۔ وزیر دفاع اور ماؤزے تنگ کے نامزد جانشین لن پیاؤ نے حکومت پر قبضہ کرنے کا بڑا جامع منصوبہ تیار کیا تھا جسے سوویت یونین کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اگرچہ ماؤ کے حامیوں نے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا اور خود لن پیاؤ لقمۂ اجل بن چکا تھا۔ پھر بھی کچھ صوبوں میں خانہ جنگی کی سی کیفیت تھی اور تمام چینی لیڈروں کی توجہ اندرونی حالات پر تھی۔ یہ ایسی صورت حال تھی کہ چینی حکومت کسی طرح بھی بھارت کے خلاف جنگ میں پاکستان کو عملی اور مؤثر امداد دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ پھر بھٹو نے پاکستان کے عوام کے سامنے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟

صرف یہی نہیں بھٹو نے جنرل یحییٰ خان پر یہ دباؤ بھی ڈالا کہ وہ روس کی بھارت نوازی کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کریں اور سوویت حکومت پر واضح کر دیں کہ وہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے سے باز آجاتے۔ اس سے پہلے سوویت حکومت نے حکومت پاکستان پر زور دیا تھا کہ وہ عوامی لیگ کے لیڈروں کے ساتھ سیاسی سمجھوتہ کرکے حالات کو معمول پر لانے کی کوشش کرے۔ جنرل یحییٰ خان نے بھٹو کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے سوویت وزیر اعظم کو ایک ایسا خط لکھا جو اپنے سخت لب و لہجے کی وجہ سے الٹی میٹم کی حیثیت رکھتا تھا۔

اب پاکستان پوری دنیا میں تنہا کھڑا تھا۔

چین اپنے اندرونی حالات کی وجہ سے اس کی عملی امداد کرنے سے قاصر تھا۔

روس کو ایسا الٹی میٹم دے دیا گیا تھا کہ اب اسے کھل کر بھارت کی پشت پناہی کرنے میں کوئی باک نہیں تھا۔

عالمی رائے عامہ پاکستان کے اکثریتی صوبے کے عوام کے خلاف فوجی قوت کے بھرپور استعمال کے نتیجے میں اسلام آباد کے حکمرانوں کے خلاف ہو چکی تھی۔
اور امریکہ کوئی ایسی پالیسی اختیار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا جو عالمی رائے عامہ کے خلاف ہو۔

ان حالات میں پاکستان پر وہ جنگ مسلط کر دی گئی جو شروع ہونے سے پہلے ہی ہاری جا چکی تھی۔

وہ دن پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا جب جنرل یحییٰ خان نے اپنے "فوجی مشیروں" کے دباؤ میں آکر مغربی پاکستان کے محاذ سے بھارت پر حملہ کر دیا۔
ہماری عظیم فوج ایک ایسی سازش کا شکار ہو گئی تھی جس کا مقصد اس کے مقدر میں مسلم تاریخ کی بدترین شکست لکھنا تھا۔

میں اس تیرہ روزہ جنگ کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا، لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ بھٹو نے ایک تیر سے دو شکار کئے تھے۔ ایک طرف تو اس نے سقوط مشرقی پاکستان کو یقینی بنا کر باقیماندہ پاکستان میں اقتدار کے دروازے اپنے آپ پر کھول لئے تھے اور دوسری طرف ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران جرأت و شجاعت کی غیر فانی داستانوں کو جنم دینے والی فوج کا وقار خاک میں ملانے کا مکمل بندوبست کر دیا تھا۔

بھٹو کے حق میں یہاں یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ وہ تو محض ایک بے بس تماشائی تھا اور اقتدار جنرل یحییٰ خان اور ان کے فوجی ٹولے کے ہاتھ میں تھا۔
دوسرے الفاظ میں وہ فیصلے جنہوں نے پاکستان کی شکست و ریخت کی بنیاد

رکھی انہیں بدلنے کا اختیار بھٹو کے پاس نہیں تھا۔

اس دلیل میں کوئی وزن نہیں۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد جو بھی اہم فیصلے ہوئے وہ بھٹو کی مرضی کے مطابق ہوئے۔ ابتدا میں اس نے اپنی عوامی طاقت کا حربہ استعمال کر کے جنرل یحییٰ خان کو بلیک میل کیا اور ان سے ایسے فیصلے کروائے جو ملک کے لئے تباہ کن ثابت ہوتے اور اس کے بعد اس نے اپنے حامی جنرلوں کی مدد سے جنرل یحییٰ خان کو اپنے عزائم کا قیدی بنا لیا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران اصل اقتدار جنرل یحییٰ خاں کے ہاتھ میں نہیں ان جنرلوں کے ہاتھ میں تھا جو اپنا مستقبل اور ملک کی تقدیر بھٹو کے ساتھ وابستہ کر چکے تھے۔

اگر بھٹو نیک نیت ہوتا اور اپنی ہوس اقتدار پر جذبۂ حب الوطنی کو ترجیح دیتا تو وہ جنرل یحییٰ خان کو پاکستان پر ایک ایسی جنگ مسلط کرنے سے روکنے کی پوری قوت رکھتا تھا جس کے نتائج قوم کے لئے تباہ کن ثابت ہوئے۔ میں یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ بھٹو بے خبر تھا، بے وقوف تھا اور نہیں جانتا تھا کہ دما دم مست قلندر کا نعرہ لگا کر قوم کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کے نتائج کیا ہوں گے۔ بھٹو سب کچھ جانتا تھا اور اس نے جو کچھ بھی کہا کیا کروایا ایک جامع اور طے شدہ منصوبے کے مطابق کہا کیا اور کروایا۔ اسے پوری طرح معلوم تھا کہ بُبّا کو کاشت کر کے گندم کی فصل نہیں اگائی جا سکتی۔ جب سلامتی کونسل میں وہ پولینڈ کی اس قرارداد کو پھاڑ رہا تھا جسے تمام بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل تھی تو وہ ایک جذباتی قوم پرست کے مجروح احساسات کا اظہار نہیں کر رہا تھا بلکہ بڑے اطمینان اور بڑی بے دردی کے ساتھ اس پاکستان کے ٹکڑے کر رہا تھا جس پر حکومت کرنا اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ اس قرارداد میں فوری جنگ بندی پر زور دیا گیا تھا اور فریقین سے کہا گیا تھا کہ

وہ تصفیہ طلب امور مذاکرات کے ذریعے طے کریں اگر یہ قرار داد منظور ہو جاتی اور بھارت کو اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا تو عساکر پاکستان کو ہتھیار ڈالنے اور جنگی قیدی بننے کی ذلت سے بچایا جا سکتا تھا۔ فتح پھر بھی بھارت کی ہوتی، لیکن ویسی فتح نہیں جیسی فتح بھارت چاہتا تھا۔ جن طاقتوں نے اس جنگ میں بھارت کا ساتھ دیا تھا۔ وہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ مشرقی پاکستان میں بھارت کو اپنی من مانی کرنے کی پوزیشن حاصل ہو جائے۔ صرف بھٹو کا مفاد اس بات میں تھا کہ پاکستان کی فوجوں کو ہتھیار ڈالنے پڑیں تاکہ وہ سپاہی جن کی جرأتوں پر پوری قوم کو ناز تھا بھارت کے جنگی قیدی بن کر ہماری ملی تاریخ پر ایسا داغ لگائیں کہ کروڑوں آنکھوں سے بہنے والے آنسو بھی اسے نہ دھو سکیں۔ پاکستان کی سرحدوں کے محافظوں کو ذلت و رسوائی کی پستیوں میں دھکیلے بغیر بھٹو یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ ملک و ملت کا حقیقی محافظ اور نجات دہندہ وہ خود ہے۔ عساکر پاکستان کے ناقابل تسخیر ہونے کا جو یقینِ محکم پوری قوم کو تھا اسے پاش پاش کئے بغیر بھٹو بلا شرکتِ غیر ملک و قوم کی قسمت کا مالک نہیں بن سکتا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد اس نے کہا تھا کہ ملک میں تین طاقتیں ہیں۔ ایک فوج۔ دوسری عوامی لیگ اور تیسری پیپلز پارٹی، عوامی لیگ کی طاقت کو اس نے فوج کے ہاتھوں ختم کروا دیا اور فوج کی طاقت کو اس نے بھارت کے ہاتھوں ختم کروا دیا اور باقی صرف پیپلز پارٹی کی طاقت رہ گئی۔ اس کی اپنی طاقت۔ بھٹو کی طاقت۔

مشرقی پاکستان پر بھارت کا قبضہ ہو گیا۔ پاکستانی فوجی بھارت کے قیدی بن گئے اور بھٹو امریکی صدر سے آشیرواد حاصل کرنے کے بعد فاتحانہ شان کے ساتھ امریکہ سے اسلام آباد پہنچا اور بڑے اطمینان کے ساتھ اس کرسی پر بیٹھ گیا جس کی خاطر اس نے اتنے جھوٹ بولے تھے۔ اتنے تماشے کئے تھے۔ اتنے ناٹک رچائے تھے۔ اتنے کھیل کھیلے

تھے۔ اتنے بہروپ اپنائے تھے۔ اتنے پاپڑ بیلے تھے اور اتنے جرائم کئے تھے۔

میر صادق نے اقتدار کے لئے فتح علی ٹیپو کے سرنگا پٹم کے دروازے انگریزوں پر کھول دیئے تھے۔ میر جعفر نے اقتدار کے لئے پلاسی کے میدان کو بنگالی مسلمانوں کی آزادی کا مدفن بنا دیا تھا۔ ابو عبداللہ نے اقتدار کے لئے اندلسی مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ غرناطہ میں فرڈی نند کے لشکر کا استقبال کیا تھا اور بھٹو نے اقتدار کے لئے اس پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جو مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کا چراغ بن کر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشے پر روشن ہوا تھا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایک فرد کی غداری کی سزا پوری قوم کو کیوں بھگتنا پڑتی ہے۔ اگر میر صادق نہ ہوتا تو شاید ٹیپو کی تلوار برطانوی سامراج کو کاٹ کر پھینک دیتی۔ اگر میر جعفر نہ ہوتا تو شاید سراج الدولہ کا جذبہ حریت پلاسی کے میدان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی قبر بنا ڈالتا۔ اگر ابو عبداللہ نہ ہوتا تو شاید فرزندانِ اسلام غرناطہ سے بلند ہونے والی تکبیریں کو پھر قرطبہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کی فضاؤں میں لے جاتے اور اگر بھٹو نہ ہوتا تو شاید ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائم ہونے والے پاکستان کی سرحدیں سکڑنے اور سمٹنے کی بجائے سری نگر تک پھیل چکی ہوتیں۔ جو پاکستان ۱۹۶۵ء میں اپنے سے پانچ گنا بڑے بھارت کے لئے ایک طاقتور چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا آج کوئی ایسا اقدام کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا جس سے بھارت کے ناراض ہونے کا خدشہ ہو۔ تاریخ کے سفر میں پاکستان ۱۹۷۱ء کے دوران بہت پیچھے رہ گیا اور بھٹو آگے بڑھتا چلا گیا۔

○ ○

برسراقتدار آنے کے بعد بھٹو نے پہلا کام یہ کیا کہ مشرقی پاکستان کا نام اپنی لغت میں سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ اپنی پہلی ہی تقریر میں اس نے مشرقی پاکستان کی بجائے مسلم بنگال کی اصطلاح استعمال کی جو آہستہ آہستہ بنگلہ دیش کا روپ دھار گئی۔

دوسرا کام بھٹو نے یہ کیا کہ ان تمام جنرلوں کو قربانی کا بکرا بنا کر الگ کر دیا جنہوں نے اسے مسندِ اقتدار تک پہنچانے کے لئے راستہ ہموار کیا تھا۔ جو شخص اقتدار کی خاطر ملکی سالمیت کو پارہ پارہ کر سکتا تھا۔ وہ ایسے جنرلوں کی دوستی کی پرواہ کیسے کرتا جو عوام کی نظروں سے گر چکے تھے؟

بھٹو کا تیسرا کام یہ تھا کہ جنرل یحییٰ خان کو سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیہ کا واحد ذمہ دار ثابت کرنے کے لئے اس نے پوری سرکاری پروپیگنڈہ مشینری کی توپوں کا رخ سابق صدر کی بدکاریوں اور سیہ کاریوں کی طرف کر دیا۔ قوم کے دماغ میں یہ بات ڈالی گئی کہ مشرقی پاکستان اس لئے ہاتھ سے گیا کہ جنرل یحییٰ خان شراب بے تحاشہ پیتے تھے اور نورجہاں اور جنرل رانی جیسی عورتوں کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے۔

بھٹو کا چوتھا کام یہ تھا کہ اس نے انٹیلی جنس کے دفتر کو سربمہر کر کے پورے ریکارڈ کو اپنے قبضے میں لے لیا اور ایسی تمام دستاویزات نذرِ آتش کر دی گئیں جن کا تعلق بھٹو کی اپنی سازشوں، سرگرمیوں اور سیہ کاریوں سے تھا۔

بھٹو کا پانچواں کام یہ تھا کہ اس نے خصوصی انتظامات کر کے ڈھاکہ سے وہ فلم منگوائی جس میں پاکستانی افواج کو بھارت کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ فلم کئی بار پاکستان ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ کی گئی تاکہ قوم خود اپنی نگاہوں سے اپنے محافظوں کی ذلت و رسوائی کا منظر دیکھے اور بھارت پر اپنی برتری ثابت کرنے کی امنگوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دے۔

اور جس روز میں نے یہ فلم دیکھی تو وہ شخص جسے میں نے اپنی ملی تمناؤں کا نقیب اور اپنے جذبۂ حب الوطنی کا جیتا جاگتا پیکر بنا رکھا تھا اچانک اپنے اصلی روپ میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ یہ روپ اتنا بھیانک تھا کہ وہ تمام چاہتیں اور وہ تمام عقیدتیں جو میں نے اس شخص سے وابستہ کر رکھی تھیں نفرت کے اس طوفان میں

تنکوں کی طرح اڑ گئیں جو میرے دل اور میری روح کی گہرائیوں سے اٹھا، وہ شخص جس نے یکم ستمبر ۱۹۶۵ ؁ کی رات کو کہا تھا کہ صلاح الدین ایوبی ؒ کے جانشین برہمنی سامراج کے جبڑے توڑ کر اپنی عظیم الشان تاریخ میں جرأت و شجاعت کے ایک نئے باب کا اضافہ کریں گے۔ وہ شخص کتنی بے دردی اور کتنی بے رحمی کے ساتھ صلاح الدین ایوبی ؒ کے جانشینوں کو برہمنی سامراج کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے دکھا رہا تھا۔ ایک ذلت آمیز شکست کے زخموں سے چور جسمِ ملت پر کیسی درندگی اور کیسی سفاکی کے ساتھ تازیانے برسائے جا رہے تھے۔ تازیانے برسانے والا ہاتھ کسی اور کا نہیں اسی شعلہ نوا لیڈر کا تھا جس نے بھارتی استعمار کے خلاف ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے کا حوصلہ قوم کو دیا تھا۔ اب اس لیڈر کو اپنی منزل مل گئی تھی اور اسے اس حوصلے کی ضرورت نہیں تھی اب اس کا مفاد اس بات میں تھا کہ اس حوصلے کو احساسِ شکست کی چکی میں پیس ڈالا جائے۔ چنانچہ وہ قوم کو دکھا رہا تھا کہ جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے اے کے نیازی نے اور جگجیت سنگھ اروڑہ کے سپاہیوں کے سامنے اے کے نیازی کے سپاہیوں نے کیسی بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈالے۔

شکست کے زخم کو گہرا کرنے اور احساسِ شکست کو دوام بخشنے کے لئے بھٹو اس سے بہتر نفسیاتی حربہ اور کونسا اختیار کر سکتا تھا کہ قوم اپنی آنکھوں سے اپنی ذلت و رسوائی کا منظر دیکھے۔

ہتھیار جنرل اے کے نیازی نہیں پاکستان ڈال رہا تھا۔ ہتھیار جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے نہیں بھارت کے سامنے ہتھیار ڈالے جا رہے تھے۔ یہی وہ بات تھی جسے اہلِ پاکستان کے ذہنوں میں بٹھانے کے لئے بھٹو نے وہ فلم خصوصی انتظامات کر کے منگوائی تھی۔

اور اس وقت جب میں اپنی ذلت اور اپنی قوم کی رسوائی کا تماشہ پاکستان ٹیلی ویژن پر دیکھ رہا تھا تو میری قومی انا کے زخموں نے چیخ کر بھٹو سے کہا تھا۔

"شاہنواز کے بیٹے۔ آج میں بے بس ہوں، میری قوم بے بس ہے اور میرے وطن کے پاسبان بے بس ہیں۔ آج تم ہم سب کی بے بسی پر قہقہے لگا سکتے ہو، لیکن یاد رکھو ہمیں ہماری بے بسی کی تصویر دکھا کر تم نے اپنے انجام کو آواز دی ہے۔ ہم تم سے اس تذلیل کا انتقام ضرور لیں گے۔ تم نے ہماری ہی نہیں صلاح الدین ایوبیؒ اور ٹیپوؒ کے خون کی تذلیل کی ہے۔ ہماری پوری تاریخ کی تذلیل کی ہے۔ یاد رکھو آج کے بعد میری اور مجھ جیسے لاکھوں قوم پرستوں کی ہر نفرت کا رخ تمہاری طرف ہو گا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کے داغ کو تم ہماری تقدیر بنانا چاہتے ہو، لیکن محمدؐ کے رب کی قسم ہم اس داغ کو اپنی تقدیر نہیں بننے دیں گے۔ آج کے بعد تم ہماری نظروں میں وہ داغ ہو جسے خود ہم ہی نے اپنی تاریخ کے چہرے پر لگایا ہے اور اس داغ کو مٹانا ہمارا نصب العین ہے۔ آج تم طاقتور ہو اور ہم کمزور ہیں، لیکن وہ دن دور نہیں جب میرا ہاتھ، میری قوم کا ہاتھ اور میرے وطن کے پاسبانوں کا ہاتھ تمہاری گردن پر ہو گا۔"

---

# شملہ سمجھوتہ اور

# سندھ کے فسادات

بھٹو، میجر عزیز بھٹی شہید
اور میجر طفیل شہید جیسے
سرفروشوں کی فوج کا
تمسخر اڑا رہا تھا اور میں
اس سے کہنا چاہتا تھا۔
"شکستِ پاکستان پر اپنے
اقتدار کا محل تعمیر کرنے
والے ملّت فروش۔ وہ دن
ضرور آئے گا۔ جب تمہارا نام
پوری قوم کے لئے گالی بن
چکا ہوگا"

میرا قلم کئی مقامات پر بہت زیادہ جذباتی ہوگیا ہے۔ لیکن میں شروع ہی میں واضح کر چکا ہوں کہ یہ کوئی تاریخی دستاویز نہیں۔ میرے جذبات کی کہانی ہے۔ میرے ان جذبات کی کہانی ہے جو صرف میرے ہی نہیں میرے لاکھوں ہم وطنوں کے جذبات بھی ہیں یہ سب کچھ لکھتے وقت میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں صرف غلام اکبر ہی نہیں پاکستان بھی ہوں۔ یہ صرف میرے جذبات کی ہی نہیں، پاکستان کی بھی کہانی ہے۔ اس پاکستان کی کہانی جسے بھٹو نے کاغذ کا ٹکڑا سمجھ کر پھاڑ ڈالا میرا قلم بھٹو کے بارے میں ہرگز ہرگز غیر جذباتی نہیں ہو سکتا۔ میں اس جھوٹ سے نفرت کیوں نہ کروں جسے کبھی میں سچ سمجھتا تھا اور میری یہی بھول مجھے شاہراہِ تاریخ کے اس مقام پر لے آئی جہاں سے میں پاکستان کی شکست و ریخت۔ خود اپنی شکست و ریخت کا تماشہ ایک بے بس تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے پر مجبور تھا۔

پاکستان ٹوٹا، بنگلہ دیش قائم ہوا اور باقیماندہ پاکستان بھٹو کے خوابوں کی تعبیر بن گیا اپنے خوابوں کی اس تعبیر کو بھٹو نے نئے پاکستان کا نام دیا اور وہ جو میرے خواب تھے وہ جنگی قیدی بن کر بھارتی کیمپوں میں چلے گئے۔

بھٹو نے اپنی پہلی ہی تقریر میں میرے مشرقی پاکستان کا نام بدل کر مسلم بنگال رکھ دیا تھا، لیکن عوام کو دھوکہ دینے کے لئے اس نے اپنے اقتدار کے ابتدائی ایام میں

بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرنے کا ڈرامہ کھیلا۔ اس نے اعلان کیا کہ جو ملک بھی بنگلہ دیش کو تسلیم کرے گا اس کے ساتھ پاکستان اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لے گا۔ اس اعلان پر چند روز تک عملدرآمد بھی کیا گیا۔ چند ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع بھی کئے گئے۔ مگر ہاتھی کے یہ دانت محض دکھاوے کے تھے۔ اندر ہی اندر بھٹو نے بنگلہ دیش کو ایک "اٹل تاریخی حقیقت" بنانے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اسی منصوبے کے مطابق اس نے ایک رات کی تاریکی میں شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر کے خصوصی طیارے کے ذریعے لندن بھجوا دیا۔ اتنے بڑے تاریخی حادثے کے اتنے اہم کردار کو اتنی پراسرار خاموشی کے ساتھ اتنے پراسرار حالات میں یہاں سے کیوں رخصت کیا گیا؟ بھٹو نے ان لیڈروں کو شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ ملاقات کا موقع کیوں نہ دیا جو عوامی لیگی رہنما کے دیرینہ دوست اور ساتھی تھے؟ شیخ مجیب الرحمان کو پریس کانفرنس سے خطاب کر کے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع کیوں نہ دیا گیا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا نا کہ شیخ مجیب الرحمان اہلِ مغربی پاکستان کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتا۔ پاکستانی جارحیت پر زبردست نکتہ چینی کرتا۔ مشرقی پاکستان میں بھارت کی فوجی مداخلت کو جائز قرار دیتا۔ بنگلہ دیش کے قیام کو بنگالیوں کے خوابوں کی تعبیر بتاتا اگر وہ یہ سب کچھ کہتا تو ہم اپنے آپ کو یہ تسلی دے لیتے کہ ایک غدار اور علیحدگی پسند سے اور کس بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہم اس کی باتوں کے زہر کو اسی صبر کے ساتھ پی لیتے جس صبر کے ساتھ ہم نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیے اور جنرل اروڑہ کے سامنے پاکستانی فوجوں کے ہتھیار ڈالنے کے سانحے کو سہہ لیا تھا۔ اس طرح بھٹو کو اپنی پوزیشن صاف کرنے کا ایک بڑا ہی سنہری موقع مل جاتا اور وہ بڑے اعتماد کے ساتھ عوام کو یہ بتانے کے قابل ہو جاتا کہ پاکستان میری ہوسِ اقتدار کی وجہ سے نہیں، شیخ مجیب الرحمان کی غداری کی

وجہ سے ٹوٹا ہے۔"

اور یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ شیخ مجیب الرحمان بھارتی جارحیت کے نتیجے میں قائم ہونے والے بنگلہ دیش پر ایسے بنگلہ دیش کو ترجیح دیتا جو آزاد ہو کر بھی پاکستان کا حصہ ہو۔ شیخ مجیب الرحمان یہ بھی تو کہہ سکتا تھا:" ہم نے عام انتخابات میں واضح کامیابی حاصل کی تھی۔ پھر بھی ہمیں حکومت بنانے کا حق نہ دیا گیا۔ ہمارے خلاف فوجی کارروائی کی گئی۔ ہمیں طاقت کے ذریعے کچلنے کی کوشش کی گئی جس کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ اب ہمارے درمیان فاصلے بہت بڑھ چکے ہیں۔ پھر بھی متحدہ پاکستان کو قائم رکھنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکالی جا سکتی ہے۔ ہم سیاسی طور پر الگ ہو چکے ہیں۔ لیکن نظریاتی طور پر ہم اب بھی ایک جھنڈے تلے زندہ رہ سکتے ہیں آپ مجھ پر اعتماد کا اظہار کریں تو ٹوٹے ہوئے رشتے پھر استوار ہو سکتے ہیں۔"

ممکن ہے کہ شیخ مجیب الرحمان کچھ بھی نہ کہتا۔ یا پھر صرف یہ کہتا کہ "مجھے کچھ نہیں کہنا۔ میں بنگلہ دیش جانا چاہتا ہوں۔"

لیکن بھٹو نے آخر کس مقصد کے لئے اسے چوری چھپے ملک سے باہر نکال دیا؟ اگر شیخ مجیب الرحمان غدار تھا تو بھٹو کو کیا حق تھا کہ عوام کو اعتماد میں لئے بغیر دوسرے لیڈروں سے مشورہ کئے بغیر اس غدار کو رات کی تاریکی میں ہوائی جہاز پر بٹھا کر لندن بھیج دے؟ بھٹو کو کس بات کا خطرہ تھا؟ کہیں اسے یہ ڈر تو نہیں تھا کہ جو بازی اس نے اتنی تگ و دو کے بعد جیتی تھی۔ وہ شیخ مجیب الرحمان کی وجہ سے خطرے میں پڑ سکتی ہے؟ یہ سوال میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جو آج بھی بھٹو کے جھوٹ پر ایمان رکھتے ہیں؟

غداری کس نے کی تھی؟

اس شخص نے جو گنگا طیارہ اغوا کر کے پاکستان لانے اور لاہور کے ہوائی اڈے

پر تباہ کرنے والوں کو قومی ہیرو ثابت کرنے پر تل گیا تھا ؟

یا اس شخص نے جس نے قوم خبردار کیا تھا کہ یہ ایک سازش ہے جس کا مقصد مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان فضائی رابطے کو دشوار بنانا ہے ؟

کیا بھٹو کے پاس دماغ نہیں تھا کہ اسے اس واقعے پہ بھارتی ردِ عمل کا اندازہ نہ ہو پایا۔

جو بات شیخ مجیب الرحمان کے ذہن میں آگئی وہ بھٹو کے ذہن میں کیوں نہ آئی حالانکہ بھٹو کو دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے شیخ مجیب الرحمان سے بہت بلند شمار کیا جاتا ہے ؟

شیخ مجیب الرحمان سمجھ گیا کہ یہ سارا ڈرامہ بھارت نے اس مقصد کے لیے کھیلا ہے کہ اسے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان پروازوں پر پابندی لگانے کا بہانہ مل جائے۔ لیکن بھٹو کا شاطر دماغ بھارت کی اس حکمتِ عملی کو سمجھنے سے قاصر رہا۔

اگر شیخ مجیب الرحمان غدار ہوتا اور اس کا مفاد مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان فضائی رابطہ ٹوٹ جانے میں ہوتا تو وہ اہلِ پاکستان کو اس بھارتی سازش کے بارے میں خبردار کرنے کی زحمت کیوں کرتا ؟

اور اگر بھٹو غدار نہیں تھا تو اس نے عوام کو اس امکان سے باخبر کرنا ضروری کیوں نہ تصور کیا کہ بھارتی طیارے کو اغوا کر کے پاکستان لانے اور اہلِ پاکستان سے خراجِ تحسین حاصل کرنے والے "کشمیری حریت پسند" بھی خطرناک بھارتی سازش کے مرکزی کردار بھی ہو سکتے ہیں ؟ کشمیری حریت پسندوں سے اس نوعیت کا "مجاہدانہ" کارنامہ عین اس وقت کیوں سرانجام دلایا گیا جب بھٹو کی سیاست مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان کے ساتھ تصادم کے راستہ پر لیے جا رہی تھی ؟ کیا یہ محض اتفاق تھا یا اسی سازش کی

کر ڈی تھی جس کے تحت پاکستان کو توڑا گیا ؟

اور اگر بھٹو محض کشمیری عوام کے جذبہ حریت کے ساتھ گہری وابستگی ظاہر کرنے کے جوش میں اپنے شاطر دماغ سے کام نہ لے سکا تو اس نے اپنے دورِ اقتدار میں اس گہری وابستگی اور اس جوش کا مظاہر کرنے سے پرہیز کیوں کیا ؟ جس بھٹو نے اپنی لیڈری کی بنیادیں کشمیر کو ہر قیمت پر آزاد کرانے کے عزم پر استوار کی تھیں اس بھٹو نے مسئلہ کشمیر کو شملہ سمجھوتے کی قبر میں کیوں دفن کر دیا ؟ اور اگر اس نے مسئلہ کشمیر کو شملہ سمجھوتے کی قبر میں دفن نہیں کیا تو پھر اس کے ساڑھے پانچسالہ دورِ اقتدار میں اس مسئلہ کے حل کے لئے کیا کیا کوششیں کی گئیں ؟

اگر یہ سوالات بھٹو کے جھوٹ پر ایمان رکھنے والوں کے ذہنوں میں نہیں ابھرے تو مجھے کوئی حیرت نہیں۔ ابوجہل نے بھی تو دمِ آخر تک سچائی کی روشنی اپنے دل و دماغ میں داخل نہیں ہونے دی تھی اور وہ سرزمین پنجاب بھی تو یہی تھی جہاں انگریزوں نے ایک نبی کو جنم دیا تو خاتم النبین کی امت میں سے کچھ لوگوں نے اس عظیم جھوٹ کی دہلیز پر سجدے شروع کر دیئے تھے۔ یہاں میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

"مجھے اپنی امت کے لئے جس شخص سے زیادہ خطرہ لاحق ہے وہ ایک منافق آدمی ہے۔ جس کی زبان بڑی چکنی چپڑی مگر اس کا دل نورِ حکمت سے خالی ہے وہ اپنی فصاحت و بلاغت سے لوگوں میں انقلاب پیدا کرتا ہے اور اپنی جہالت کے باعث ان کی گمراہی کا موجب بنتا ہے۔"

بھٹو نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا۔
"پچھلی حکومتیں جب کسی مسئلے کو دفن کرنا چاہتی تھیں تو اس کے لئے کوئی کمیشن وغیرہ قائم کر دیا کرتی تھیں۔ میں اس روایت کو ختم کر دوں گا۔"
چند ہی روز بعد بھٹو نے ایک کمیشن قائم کیا جسے دنیا حمود الرحمان کمیشن کے نام سے جانتی ہے۔ اس کمیشن کا مقصد سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیے کے اسباب دریافت کرنا اور اس کی ذمہ داری کا تعین کرنا تھا۔

گویا بھٹو کے اپنے الفاظ کے مطابق یہ پہلا مسئلہ تھا جسے وہ دفن کرنا چاہتا تھا اور بھٹو کے ساڑھے پانچ سالہ دور کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب رہا۔ بھٹو سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب دریافت کرنے اور اس کی ذمہ داری کا تعین کرنے کے معاملے میں کیسے سنجیدہ ہو سکتا تھا؟ وہ تو خود تاریخ اسلام کے اس سانحۂ عظیم کا مرکزی کردار تھا۔

بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے اور غریب عوام کو راتوں رات دولت مند بنا دینے کے نعروں کے ذریعے وہ مسندِ اقتدار پر قابض ہو چکا تھا اب ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ اپنے "بے مثال تدبر" اور اپنی "بے انداز سفارتی صلاحیتوں" کا سکہ عوام پر جمانے کے لئے بھارت جاتے اور اندرا گاندھی کو مقبوضہ علاقوں سے فوجوں کی واپسی اور جنگی قیدیوں کے تبادلے پر مجبور کر دے۔
چنانچہ پوری سرکاری پروپیگنڈہ مشینری یہ ثابت کرنے کے لئے حرکت میں آگئی کہ اگر بھٹو بھارت کو مقبوضہ علاقوں سے اپنی فوجیں واپس لے جانے اور جنگی قیدیوں کا تبادلہ کرنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ کارنامہ مسلمانوں کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مقبوضہ علاقوں پر دیر تک قبضہ برقرار رکھنا اور نوے ہزار

جنگی قیدیوں کے اخراجات پورے کرنا بھارتی معیشت پر بہت بڑا بوجھ تھا اور بھارتی حکومت وقت ضائع کئے بغیر ان معاملات کو طے کرنے کے موڈ میں تھی۔

اس سلسلہ میں چند ماہ کی جو تاخیر ہوئی وہ بھٹو کی حکمتِ عملی کے نتیجے میں ہوئی۔ بھٹو بھارت کے "تاریخی سفر" پر جانے سے پہلے اہلِ پاکستان کے ذہنوں میں یہ بات پوری طرح بٹھا دینا چاہتا تھا کہ وہ ایک ایسا معرکہ سر کرنے جا رہا ہے جو اس کی قائدانہ صلاحیتوں پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کے مترادف ہو گا۔ اس کے علاوہ سندھ میں لسانی مسئلہ کھڑا کرنے اور اس مسئلے پر فسادات کرانے کے منصوبے کو آخری شکل دینے کے لئے بھی کچھ وقت درکار تھا۔

اسے معلوم تھا کہ وہ مقبوضہ علاقوں کو واپس لینے اور جنگی قیدیوں کو رہا کرانے کے لئے بھارت نہیں جا رہا۔ بلکہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے اور مسئلہ کشمیر کو بھول جانے کے بارے میں اندرا گاندھی کے ساتھ ایسا سمجھوتہ کرنے کے لئے جا رہا ہے، جو "نئے حالات" میں پاک بھارت تعلقات کو "مستحکم" بنیادوں پر استوار کرنے کی "حقیقت پسندانہ" ضرورت پوری کرے گا۔ اور وہ جانتا تھا کہ اس کے مخالف اس قسم کے سمجھوتے کے خلاف عوام کے قومی احساسات و جذبات کو جگانے اور بھڑکانے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے اس موقع پر کوئی ایسا بحران پیدا کرنا ضروری تھا جو قوم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکے۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ اِدھر بھٹو شملہ کی یاترا سے واپس آیا اور اُدھر سندھ اسمبلی میں حکومت نے زبان کے مسئلہ پر ایک ایسا بل پیش کر دیا جو سندھ کی مقامی و غیر مقامی آبادی کے درمیان خونریز فسادات کا باعث بنا۔ جو حضرات اس قسم کی باتوں کو اتفاق قرار دے کر نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اگر تنقیدی نظر سے بھٹو کے عروج کا جائزہ لینے کی زحمت کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس شاطر سیاست دان کی پوری سیاسی زندگی ایسے اتفاقات سے بھری پڑی ہے جنہیں اس نے خود جنم دیا اور خود ہی

ان سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بھی تو ایک اتفاق تھا کہ جب سلامتی کونسل میں پولینڈ کی قرارداد پیش ہوئی تو بھٹو کی "قومی غیرت" جوش میں آگئی اور اس جوش میں اس نے اس قرارداد کو پھاڑ ڈالا جو پاکستانی فوجوں کو بھارتی سینا کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی ذلت سے بچا سکتی تھی بھٹو کا یہی "اتفاقیہ" جوش اس پر اقتدار کے دروازے کھولنے کا باعث بنا۔

بھٹو کی کامیابیوں کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہر کام واضح اور مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ کرتا تھا۔ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ایسے راستے اختیار کرتا تھا جن کی دوسروں کو توقع بھی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شملہ میں کی جانے والی سودے بازی سے قوم کی توجہ ہٹانے کے لئے وہ اپنے ہی صوبے میں آگ اور خون کا طوفان کھڑا کرا دے گا۔ اس حکمتِ عملی کے ذریعے ایک طرف تو وہ شملہ سمجھوتے کے خلاف اٹھنے والے ہر ممکنہ طوفان کے خلاف ایک "سنگین مسئلے" کا بند باندھ رہا تھا اور دوسری طرف "سندھی نیشنلزم" کے جذبات کو ابھار کر سندھی بولنے والے عوام کی نظروں میں ایک "قومی ہیرو" کا درجہ حاصل کر رہا تھا۔

میرے اس موقف کا مطلب یہ ہے کہ بھٹو شملہ جانے سے پہلے ہی اپنے ذہن میں شملہ سمجھوتہ کر چکا تھا۔ میں اپنے اس موقف کی حمایت میں اس ملاقات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو بھٹو نے شملہ جانے سے پہلے ملک کے دانشوروں، ادیبوں اور صحافیوں کے ساتھ کی تھی۔ اس ملاقات کا اہتمام مری میں کیا گیا تھا اور اسے میں پریس کانفرنس اس لئے نہیں کہوں گا کہ اس میں جو باتیں ہوئیں وہ اشاعت کے لئے نہیں تھیں۔

میں اس زمانے میں اپنے اور اپنے دوستوں کے تمام وسائل ایک ایسے جریدے کے اجراء پر صرف کر چکا تھا۔ جو قوم کی کچلی ہوئی امنگوں کو احساسِ شکست کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے مشن میں بھرپور کردار ادا کر سکے اس جریدے کا نام اشتراک تھا۔ میرے

عزائم بہت بلند اور میرے وسائل بہت ہی محدود تھے اور عزائم اور وسائل کے درمیان اس عدم توازن کو دور کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری آواز بہت ہی کم کانوں تک پہنچ سکے گی۔ کیوں کہ ایک کثیر الاشاعت ہفت روزے کی منصوبہ بندی سرمائے کی فراہمی کے بغیر نہیں ہوسکتی اور میرا واحد سرمایہ میرا قلم تھا جس کی حرمت برقرار رکھنے کے لئے میں نے اپنے آپ پر آسودگی کے دروازے بند کردیئے تھے۔
میرے پاس جو معمولی رقم تھی وہ دفتر وغیرہ قائم کرنے پر صرف ہوگئی تھی۔ اشتراک کے پہلے تین شمارے میں نے دوستوں سے ادھار لے کر نکالے تھے۔ چوتھے شمارے کے لئے میں رقم کا انتظام کرنے میں مصروف تھا کہ پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے مجھے ایک دعوت نامہ ملا۔ بھٹو مری میں صحافیوں اور دانشوروں سے ملاقات کرنے والا تھا۔ یہ دعوت نامہ مولانا کوثر نیازی نے بطور خاص مجھے بھجوایا تھا اور مجھے بتایا گیا کہ اشتراک کے سوا دوسرے کسی جریدے کے ایڈیٹر کو مدعو نہیں کیا گیا۔ میں بھٹو کے دربار میں حاضری دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا مگر میرے ایک رفیق کار نے مشورہ دیا کہ مجھے بھٹو کے خیالات جاننے کے لئے ضرور جانا چاہیئے۔ چنانچہ میں گیا اور میں نے اپنے کانوں سے وہ باتیں سنیں جو میں سننا نہیں چاہتا تھا۔
وہ میری نظروں کے سامنے بیٹھا میری ان امنگوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔ جنہوں نے اسے لیڈر بنایا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
" آپ ملک کے دانشور ہیں۔ آپ کا ذہن عوام کے لئے مشعلِ راہ بنتا ہے آپ عوام کی ذہنی وجذباتی تربیت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ صحیح خطوط پر رائے عامہ کی تشکیل آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ جذباتی باتیں کرکے لوگوں کو گمراہ بھی کر سکتے ہیں اور انہیں زندگی کے تلخ حقائق سے آگاہ کرکے حقیقت پسند بھی بنا سکتے ہیں یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ ہمیں حقیقت پسند بننا چاہیئے یا جذباتی

کے بھنور میں پھنسے رہنا چاہیئے۔ مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے آپ ہی بتائیں کہ کیا موجودہ حالات میں بھی ہم مہم جوئی کی عیاشی کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ کشمیر کی آزادی ایک بڑا ہی حسین تصوّر ہے، لیکن ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟ خود کشمیری آزاد نہیں ہونا چاہتے تو بھارت کے خلاف جنگی جنون کو ہوا دینے کا کیا فائدہ؟ اگر آپ کو کوئی فائدہ نظر آئے تو مجھے بتائیں۔ میں پوری سنجیدگی سے غور کروں گا۔ آپ کہیں تو میں کل ہی بھارت کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میرا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ مسئلہ پاکستان کا ہے جسے نئے حالات میں اپنی پالیسی وضع کرنی ہے۔ ہمارا مسئلہ جنگی قیدیوں کو واپس لانا ہے۔ ان علاقوں کو حاصل کرنا ہے جن پہ بھارت نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ اسی مقصد کے لئے میں شملہ جا رہا ہوں۔ اندرا گاندھی سے سودے بازی آسان نہیں۔ ظاہر ہے کہ مجھے کچھ باتیں اس کی ماننی پڑیں گی تاکہ کچھ باتیں اپنی منوا سکوں۔ کوشش تو پوری کروں گا کہ پاکستان کا وقار مجروح نہ ہو لیکن اندرا گاندھی کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ اس نے جنگ جیتی ہے اور ہماری فوجوں نے جنگ ہاری ہے۔ کہنے کو تو ہم یہی کہہ رہے ہیں کہ اس شکست میں ہماری فوج کا کوئی قصور نہیں مگر اصل حقیقت آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں۔ یہ قطعی طور پر ایک فوجی شکست تھی ورنہ ہمارے اتنے ہزار جنگی بھارتی کیمپوں میں نہ ہوتے۔ آپ ہی بتائیں کہ ہم سخت رویہ کس بنیاد پر اختیار کریں۔ ہم کیسے اس فوج پر بھروسہ کریں جسے اتنی بڑی شکست ہوئی۔ آپ کے خیال میں یہ فوج کشمیر حاصل کر سکتی ہے؟ ہمیں اپنی سوچ کو حقیقت پسند بنانا ہوگا۔ ہمیں فوجی ڈھانچے کی از سرِ نو تشکیل بھی کرنی ہوگی۔ باقی رہا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مسئلہ تو آخر کب تک ہم حقیقت سے آنکھ چرا سکتے ہیں۔ ہم دوبارہ تو اس پہ فوجی قبضہ نہیں کر سکتے۔ آپ تمام باتیں سوچیں اور پھر مجھے مشورہ دیں"۔

وہ بولتا جا رہا تھا اور میرا خون کھول رہا تھا۔
میری جن امنگوں کا نقیب بن کر وہ بام عروج کو پہنچا تھا اب وہ قومی امنگیں اس کے لئے جنگی جنون کا درجہ رکھتی تھیں۔
پاک فوج کا ذکر کرتے وقت اس کے لہجے میں تمسخر تھا، تضحیک تھی۔
پاکستان کی فوجی شکست کی بات اس نے بڑی فاتحانہ شان کے ساتھ کی تھی۔
کاش کہ اس وقت مجھ میں اتنی جرأت پیدا ہو سکتی کہ اٹھ کر اس کے منہ پر طمانچہ مارتا اور کہتا۔

"دغا باز فریبی بہروپیئے۔ اس وقت تمہاری حقیقت پسندی کہاں گئی تھی جب چین سے واپس آکر تم نے دمادم مست قلندر کے نعرے کے ساتھ بھارت پر دھاوا بول دینے کا اعلان کیا تھا؟ اس وقت تمہاری حقیقت پسندی کہاں گئی تھی جب تم نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں پولینڈ کی قرار داد کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے؛ اس وقت تمہاری حقیقت پسندی کہاں گئی تھی جب ہاکی کا پہلا ورلڈ کپ ٹورنامنٹ لاہور میں منعقد ہونے والا تھا اور تم نے اعلان کیا تھا کہ اہل پاکستان بھارتی ہاکی ٹیم کا وجود اپنی سرزمین پر برداشت نہیں کریں گے؟ اس وقت تمہاری حقیقت پسندی کہاں گئی تھی جب بھارتی طیارے کو اغوا کر کے پاکستان لانے اور اسے تباہ کرنے والے ایجنٹوں کو عظیم قومی ہیرو قرار دیتے وقت تم بھول گئے تھے کہ اس واقعے کے کتنے سنگین نتائج برآمد ہوں گے؟۔ اس وقت تمہاری حقیقت پسندی کہاں گئی تھی جب تم نے تمام سفارتی آداب بالائے طاق رکھ کر سلامتی کونسل کے اجلاس میں "بھارتی کتے" جیسے گرے ہوئے الفاظ استعمال کئے تھے؟ اس وقت تمہاری حقیقت پسندی کہاں گئی تھی۔ جب تم نے بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ جاری رکھنے کے عزم کا اعلان کیا تھا؟۔

شاہنواز کے بیٹے آج میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ تم نے جس ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے وہ واقعی میری قوم سے تعلق نہیں رکھتی۔ تمہاری رگوں میں دوڑنے والے خون کا رشتہ واقعی کسی برہمن زادے سے جا ملتا ہے۔ میں آج تہذیب و اخلاق کے تمام بندھن توڑ کر تمہیں وہ گالی دیتا ہوں۔ جس سے بڑی کوئی گالی نہیں۔

میں یہ گالی تمہیں اس لئے دے رہا ہوں کہ تم نے میجر عزیز بھٹی شہید اور میجر طفیل شہید جیسے سرفروشوں کی فوج کو گالی دی ہے۔ تم نے اس مقدس خون کو گالی دی ہے جو وطنِ عزیز کی حریت و حرمت پر نثار ہو گیا۔ تم نے میری پوری تاریخ کو گالی دی ہے جو تم جیسے غداروں کے باوجود ہر دور اور ہر صدی میں محمدؐ کی امت کی عظمتوں کی امین رہی ہے۔ تم نے اس محمدؐ کی امت کو گالی دی ہے جس کے چند مٹھی بھر جان نثار قیصر و کسریٰ کی بے پناہ قوت سے ٹکرا گئے تھے۔

شکستِ پاکستان پر اپنے اقتدار کا محل تعمیر کرنے والے ملت فروش ——
وہ دن ضرور آئے گا جب تمہارا نام پوری قوم کے لئے گالی بن چکا ہو گا۔"

○ ○
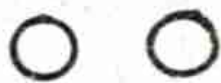
شملہ میں اہل پاکستان کو بے وقوف بنانے کے لئے جو ڈرامہ کھیلا گیا یہاں اس کی تفصیلات میں جانا ضروری نہیں۔ موٹی بات یہ ہے کہ آخر وقت تک یہ تاثر پیدا کیا جاتا رہا کہ بنیادی مسائل پر اختلافات اتنے وسیع ہیں کہ مذاکرات کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کوئی نہیں ہو گا۔ پھر اچانک بھٹو اور اندرا نے بند کمرے کی تنہائی میں ملاقات کی اور جب وہ باہر نکلے تو تمام اختلافات ختم ہو چکے تھے اور دونوں لیڈروں کے درمیان اتفاقِ رائے ہو چکا تھا۔ اس

اتفاقِ رائے کو شملہ سمجھوتہ کا نام دیا گیا اور بھارت کو سالمیتِ پاکستان کا دشمن قرار دینے والا بھٹو اچانک پاک بھارت دوستی اور پورے برصغیر کے عوام کی مشترکہ خوش حالی کا نقیب بن گیا۔

بمبئی کے ہفتہ وار "بلٹز" کے ایڈیٹر نے بھٹو سے پوچھا۔

"آپ کی باتوں میں اس قدر تضاد کیوں ہے ؟ ایک طرف تو آپ پاکستان کے عوام میں بھارت کے خلاف نفرت پیدا کر رہے ہیں اور دوسری طرف ایسے رہنما کی حیثیت سے مشہور ہونا چاہیئے ہیں جس نے برصغیر میں امن و امان قائم کیا۔ آپ کے حقیقی خیالات کیا ہیں ؟"

بھٹو نے کھلے الفاظ میں جواب دیا۔

"میں بنیادی طور پر سیاست دان ہوں اور سیاست دان کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ نظریات کی بجائے حالات کا ساتھ دے۔ جو سیاست دان حالات سے فائدہ نہ اٹھا سکے اسے کوئی اور مشغلہ اختیار کر لینا چاہیئے۔"

شملہ جانے سے پہلے بھٹو نے اپنے ہندو دوست پیلو مودی کو لکھا تھا۔

"میں برسرِ اقتدار آنے کے بعد تمہیں فون کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اس خواہش کو دبا دیا کیوں کہ ہمارے دونوں ہی ملکوں میں تنگ نظروں اور بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن اب میں عنقریب تم سے ملاقات کروں گا۔ آہستہ آہستہ دونوں ملکوں کے درمیان امن اور دوستی کی فضا ہموار ہو چکی ہے۔"

یہ اس بھٹو کا حقیقی روپ ہے جو برسہا برس تک میرے اور مجھ جیسے لاکھوں تنگ نظروں اور بے وقوفوں کے جذبات سے کھیلتا رہا۔

مشرقی پاکستان پر پاکستان کے حق سے دستبردار ہوتے اور اندرا گاندھی کے ساتھ کشمیر کا سودا کرنے کے بعد جب وہ فاتحانہ شان کے ساتھ واپس

پہنچا تو اس کا فقید المثال استقبال کرانے کے سرکاری انتظامات اس قدر مکمل اور مؤثر تھے کہ بادامی باغ سے جو بس لائل پور جانے کے لئے بھی نکلی اس کا رخ بھی لاہور کے ہوائی اڈے کی طرف موڑ دیا گیا۔

قومی اسمبلی میں ایسے ضمیر فروشوں کی کمی نہیں تھی جو بھٹو کو امن کا پیغمبر ثابت کرنے کے لئے تیار تھے۔ المیہ یہ ہے کہ چودھری ظہور الٰہی جیسے مسلم لیگی نے بھی شملہ سمجھوتے کو ایک عظیم سفارتی کارنامہ قرار دینے سے دریغ نہ کیا۔

میں نے اشتراک کے لئے "امن کا پیغمبر" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس میں میں نے عوامی نمائندوں کی امن دوستی کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ میں نے لکھا۔

" اگر ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنرل مانک شا کی فوجیں ذرا جرأت سے کام لے کر لاہور کے مٹھی بھر محافظوں کو زیر کر لیتیں تو "امن کا پیغمبر" بننے کے لئے قائدِ عوام کو سات برس تک انتظار نہ کرنا پڑتا۔ بہرحال سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیئے نے ہمارے عوامی نمائندوں میں امن دوستی کے جو جذبات پیدا کئے ہیں ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اندرا گاندھی نے دہلی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک بھارتی ناری نے ایک ہزار سال کی ہزیمتوں کا انتقام لے لیا ہے۔ اب ہمارے قائدِ عوام نے شملہ میں امن کی جنگ جیت کر اس رسوائی کا بدلہ لے لیا ہے۔ جس کا سامنا ہماری فوجوں نے ۱۵ / دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہتھیار ڈالتے وقت کیا۔

ہمارے عوامی نمائندوں کو اب اس دن کا انتظار کرنا چاہیئے جب قائدِ عوام بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے پوری دنیا پر ثابت کر دیں گے کہ وہ واقعی امن کے پیغمبر ہیں۔ وہ دن ہماری تاریخ کا روشن ترین دن ہوگا اور ہمارے عوامی نمائندے

بہت بڑے پیمانے پر قومی جشن منانے میں حق بجانب ہوں گے“۔

بنگلہ دیش کے سلسلہ میں میری پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ شملہ سمجھوتے کے فوراً ہی بعد پوری سرکاری پروپگینڈہ مشینری عوام کو یہ درس دینے کے لئے حرکت میں آگئی کہ پاکستانی مسلمانوں کو اپنے بنگلہ دیشی بھائیوں کے ساتھ ٹوٹے ہوئے برادرانہ رشتے دوبارہ جوڑ لینے چاہئیں اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ بھارتی جارحیت کے نتیجے میں قائم ہونے والے بنگلہ دیش کو ایک آزاد سیکولر مملکت کے طور پر تسلیم کر کے مشرقی پاکستان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریخ کے صفحات میں دفن کر دیا جائے۔

---

## بھٹو کے پانچ نکات

اگر میں اصغر خان کا صفایا
کرنے میں کامیاب ہو گیا تو
اگلی ربع صدی تک دنیا
کی کوئی طاقت مجھے اقتدار
سے الگ نہیں کر سکے گی۔

برسرِ اقتدار آنے کے بعد بھٹو نے تاحیات حکومت کرنے کا جو منصوبہ بنایا اس میں پانچ باتیں بنیادی اہمیت کی تھیں۔

۱۔ اندرا گاندھی کے ساتھ اشتراکِ فکر و عمل کیا جائے اور پاک فوج کو مستقل طور پر احساسِ شکست اور دباؤ میں رکھنے کے لئے اسے نفسیاتی طور پر بلیک میل کیا جائے کہ اگر اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی تو پنجاب کی سرحدیں عبور کرنا اندرا گاندھی کی فوجوں کے لئے مشکل کام نہ ہوگا۔

۲۔ "بنگلہ دیش" کو جلد از جلد تسلیم کر لیا جائے تاکہ اگر قائد اعظمؒ کے پاکستان کے دونوں بازوؤں میں کبھی کوئی ایسی تحریک اٹھے جس کا مقصد کنفیڈریشن کا قیام ہو تو مشرقی پاکستان میں کام کرنے والی مضبوط بھارتی لابی یہ موقف اختیار کر سکے کہ اب "بنگلہ دیش" ہر لحاظ سے ایک آزاد اور خود مختار مملکت ہے اور اس کی آزادی اور خود مختاری کو پاکستان بھی تسلیم کر چکا ہے۔ لہٰذا دونوں ملکوں کے درمیان دوستی تو ہو سکتی ہے، لیکن دونوں کو ایک ملک کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

۳۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو قائم ہونے والی حکومت کی غیر آئینی حیثیت ختم کرنے کے لئے اپوزیشن کی جماعتوں کا تعاون حاصل کیا جائے اور ایسا آئین تیار کیا

جائے جس پر تمام لیڈر اور جماعتیں دستخط کر دیں تاکہ حکومت آئینی طور پر اپنے قیام اور وجود کو جائز قرار دے سکے۔
یہ بات بھٹو کے لئے بڑی اہم تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیے کے بعد دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی قومی اسمبلی خود بخود ختم ہو گئی تھی اور نئے حالات میں نئے انتخابات کے ذریعے ہی باقی ماندہ ملک کی قومی اسمبلی قائم ہو سکتی تھی جس میں اکثریت کی حامل پارٹی کو حکومت کرنے کا حق ہوتا۔
۴۔ ملک کے تمام اداروں کو تباہ کر دیا جائے۔ معاشرے کی اخلاقی قدروں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ عوام کے تمام طبقوں کو حرص، لالچ اور ہوسِ زر کے شکنجے میں جکڑ دیا جائے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں نظم و ضبط کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ ہر فرد اپنی مادی و حیوانی خواہشات کا غلام بن کر رہ جائے۔ قوم میں بے حسی بے غیرتی اور بے ضمیری کے جراثیم کو اتنی کثرت کے ساتھ پھیلایا جائے کہ اس کے اندر اچھائی اور برائی بلندی اور پستی کے درمیان تمیز کرنے کا شعور و احساس ہی باقی نہ رہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ضروری تھا کہ جب کوئی قوم تمام اخلاقی اقدار سے منہ موڑ لیتی ہے تو اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی کہ اس کے حکمران کون ہیں۔
۵۔ مناسب موقع پر صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اکثریت رکھنے والی پارٹیوں کا وجود ختم کر دیا جائے اور وہاں بھی پیپلز پارٹی کا ترنگا لہرا دیا جائے اس کے بعد پورے ملک میں خوف و ہراس کی ایسی فضا پیدا کی جائے کہ کوئی لیڈر یا جماعت حکومت سے اختلاف کرنے سے پہلے اپنے عبرت ناک انجام کا خاکہ اپنے ذہن میں ضرور کھینچے۔ عدلیہ کو مکمل طور پر غیر مؤثر بنا کر پولیس اور ایف ایس ایف

کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جب چاہیں جسے چاہیں پکڑ لیں۔ پکڑ کر جہاں چاہیں لے جائیں اور جو سلوک چاہیں کریں۔

اِن پانچ باتوں پر عمل کر کے بھٹو اپنے اقتدار کو دوام بخش سکتا تھا۔ پہلی بات پر عمل اس نے چند ہی ماہ میں کر لیا۔ شملہ میں اصل سمجھوتہ وہ نہیں ہوا تھا جس کا اعلان کیا گیا۔ اصل سمجھوتہ میں بھٹو نے کشمیر سے دستبردار ہو کر پاکستان پر بھارت کی بالادستی تسلیم کر لی تھی۔ اس نے اندرا کو یقین دلایا تھا کہ اب پاکستان کبھی بھارتی مفادات کو چیلنج نہیں کرے گا اور آہستہ آہستہ ایسی فضا پیدا کر دی جائے گی کہ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں اور وہ بنیاد کمزور پڑ جائے جس پر پاکستان قائم ہوا تھا۔ جواباً اندرا نے بھٹو کے اقتدار کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی اور یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر کبھی بھٹو کو پاک فوج کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا تو بھارت کی پوری طاقت اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے استعمال ہو گی بمبئی کے ہفت روزہ بلٹنز کے ایڈیٹر کے ساتھ ایک انٹرویو میں اندرا گاندھی نے کہا تھا۔

"بھٹو کو سمجھنے میں بھارتی عوام غلطی پر تھے وہ ایک منجھا ہوا سیاست دان ہے اور ہوا کا رخ دیکھ کر بات کرتا ہے۔ یہ ہمارے لئے خوشی کی بات ہے کہ پاکستان کی حکومت اب ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو بھارت کے ساتھ دوستی کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بھٹو ہمارے نقطہ نظر سے ایک بہترین حکمران ثابت ہو گا۔ اور اگر اسے کسی بحران کا سامنا کرنا پڑا تو جنوب مشرقی ایشیا میں دوبارہ بے یقینی اور عدم استحکام کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ اگر میں بھٹو کے ساتھ نرم رویہ اختیار نہ کرتی تو پاکستان میں اس کی مقبولیت متاثر ہوتی جو بہر حال ہمارے مفاد میں نہیں۔"

پاکستان میں بھٹو کی مقبولیت اندرا گاندھی کے بھارت کے لئے کیوں اور کیسے مفید تھی اس کا صحیح علم تو بھٹو اور اندرا گاندھی کو ہی ہوگا۔ لیکن بھٹو کے دورِ اقتدار میں مسئلہ کشمیر کو ہماری قومی سیاست میں سے جس خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ خارج کردیا گیا اس کا علم کسے نہیں۔ وہ برہمنی سامراج جس کی نفسیات اور جس کے عزائم کی عکاسی کرتے ہوئے اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ایک بھارتی ناری نے مشرقی پاکستان میں دو قومی نظریئے کو شکست دے کر ایک ہزار سال کی شکستوں اور ہزیمتوں کا انتقام لے لیا ہے۔ اس برہمنی سامراج معماروں کے ساتھ نظریۂ پاکستان کے علمبرداروں کی دوستی کا مطلب میرے نزدیک اس کے سوا کچھ نہیں کہ اہلِ پاکستان برصغیر میں اہلِ بھارت کی بالادستی کو قطعی طور پر تسلیم کرلیں۔

ہمارے کچھ "روشن خیال" دانشوروں کی رائے ہمیشہ یہی ہے کہ بھارت کے ساتھ مصالحت کر کے ہی پاکستان کو امن اور خوشحالی کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے۔ امن ایک بہت ہی خوب صورت لفظ ہے۔ خوش حالی ایک بہت ہی حسین تصور ہے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ صرف وہی قومیں زندہ رہی ہیں جنہوں نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ہر چیلنج کا مقابلہ کیا۔ جس قوم نے بھی یہ فرض کرلیا کہ اس کا کوئی دشمن نہیں اسے کسی چیلنج کا سامنا نہیں اسے نہ تو امن کا خوب صورت لفظ اور نہ ہی خوش حالی کا حسین تصور کسی بڑی اور طاقتور قوم کا لقمۂ تر بننے سے بچا سکا۔ صرف اسی قوم نے تاریخ کے صفحات پر اپنی عظمت کی داستانیں چھوڑی ہیں جن کا کوئی طاقتور دشمن تھا اور جس نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اس دشمن کے خلاف اپنی تمام فکری و عملی صلاحیتوں کو وقف کردیا۔ قانونِ قدرت یہ ہے کہ بقا صرف طاقتور کا مقدر بنتی ہے امن اور خوشحالی ہمیشہ صرف اس قوم کو نصیب ہوتی ہے جس نے اپنے "دشمن" پر برتری حاصل کرنے کے لئے

ہر ممکن ذریعے سے طاقت [illegible] قت" کو اپنا واحد دوست بنایا۔

ہمارے سامنے ماؤزے تنگ [illegible] ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب چین میں انقلابی حکومت قائم ہوئی تو اس کی حالت [illegible] ناگفتہ بہ تھی۔ لیکن ماؤزے تنگ نے چینی عوام کے سامنے ایک طاقت ور "دشمن" رکھا اور اس طاقتور دشمن یعنی امریکہ کا مقابلہ کرنے کے لئے "طاقت" کے حصول کو چین کے ایک ایک فرد کا قومی نصب العین بنا دیا۔ امریکہ کی طرف ماؤ نے دوستی کا ہاتھ اس وقت بڑھایا جب چین خود ایک عظیم طاقت بن چکا تھا۔ ہمارے سامنے پہلی جنگ عظیم کے بعد کے جرمنی کی مثال ہے۔ ہر طرف تباہی ہی تباہی نظر آتی تھی۔ وارسیلز کے معاہدے کے تحت جرمنوں کو انتہائی ذلت آمیز شرائط پر امن کی بھیک ملی تھی۔ جرمنی اقتصادی طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ سینکڑوں مارک بوریوں میں بھر کر دیئے جاتے تھے تو ایک ڈالر ملتا تھا پھر ہٹلر اور نازی پارٹی کا ظہور ہوا۔ جرمن قوم میں یہ احساس کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا کہ پوری دنیا اس کی دشمن ہے۔ اور اسے پوری دنیا کو مغلوب کرنے کے لئے طاقت حاصل کرنی ہے۔ صرف پانچ برس میں جرمنی نے جو ترقی کی اور جتنی طاقت حاصل کی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں پانچ کروڑ جرمنوں کو ہرانے کے لئے پوری دنیا نے چھ برس تک اپنے پورے وسائل استعمال کئے اور بقول چرچل جب جنگ ختم ہوئی تو مرنے والے ہر جرمن کے مقابلے میں چھ اتحادی فوجی مرے تھے۔

زندہ رہنے کے لئے طاقت ضروری ہے۔ اس کی ایک اور زندہ مثال اسرائیل ہے۔ اسرائیل کو احساس ہے کہ پوری عرب دنیا بلکہ پورا عالم اسلام اس کا دشمن ہے اور اس نے اپنی بقا کے لئے طاقت کے حصول کو اپنا نصب العین بنا رکھا ہے۔ طاقت کی ضرورت اسی وقت محسوس کی جاتی ہے۔

جب سامنے کوئی طاقتور دشمن ہو۔ اندرا گاندھی کو معلوم تھا کہ جب تک اہلِ پاکستان بھارت کو اپنا دشمن تصور کرتے رہیں گے اس وقت تک ان کے اندر طاقتور بننے کی ضرورت کا احساس بھی رہے گا۔ چنانچہ بھٹو کے ذریعے اہلِ پاکستان کو یقین دلایا گیا کہ بھارت سچ مچ برصغیر میں پائیدار امن کا خواہاں ہے۔ اس لئے دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کی بنیاد رکھ دینی چاہیئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ بھٹو نے پاکستان میں جبر و استبداد کا جو نظام قائم کیا اور نام نہاد عوامی حکومت نے قانون کی عصمت کو جس وحشیانہ انداز میں لوٹا اس کی بڑی وجہ اندرا گاندھی کی دوستی پر بھٹو کا مکمل اعتماد تھا۔ ایف ایس ایف کے نام سے اپنی ذاتی پولیس قائم کرنے کے بعد بھٹو کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اختلاف کی کسی بھی لہر، احتجاج کی کسی بھی آواز اور مزاحمت کی کسی بھی کوشش کو کچلنا اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گا۔ برسرِ اقتدار آنے سے پہلے وہ فوج کو رسوائی و تضحیک کا نشانہ بنوا چکا تھا۔ مزید اطمینان اسے اس بات کا تھا کہ اگر کسی مرحلے پر فوج نے کسی عوامی تحریک کے زیر اثر آکر اس کے اقتدار کو چیلنج کیا تو وہ اندرا گاندھی کی دوستی کو فوج کے خلاف کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکے گا۔ ایک موقع پر اس نے پاکستان کے عوام کو دھمکی بھی دی تھی کہ اگر اسے اقتدار سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی تو ہمالیہ بھی روئے گا۔ اس دھمکی کے دو ہی مفہوم ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ اگر بھٹو کو اقتدار سے ہٹایا گیا تو ہمالیہ سے بہنے والے سارے پانی کا رخ پاکستان کی طرف کر دیا جائے گا اور ملتِ پاک اس پانی میں غرق ہو جائے گی۔ دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا تھا کہ پاکستان کا اتنا برا حشر کیا جائے گا کہ اس کے انجام پر ہمالیہ بھی آنسو بہائے گا۔

بھٹو کے جھوٹ کی پرستش کرنے والے بہت سے لوگ میرے اس

تجزیئے کو احمقانہ قرار دیں گے۔ کیوں کہ کوئی بھی انسان اتنا گرا ہوا نہیں ہو سکتا کہ اپنے وطن کے ساتھ اتنی بڑی دشمنی کرے۔ میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں مگر میرا تو مؤقف ہی یہ ہے کہ بھٹو کا کوئی وطن نہیں۔ اس نے اپنی ذات کو ہی اپنے وطن کا درجہ دے رکھا ہے اور جو چیز بھی اس کی ذات سے ٹکرائے وہ اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ جب مشرقی پاکستان کے عوام اس کی ذات سے ٹکرائے تو وہ پاکستان کی سالمیت کا دشمن بن گیا۔

یہ بھٹو کی بدقسمتی تھی کہ جس اعتماد کے ساتھ اس نے ۷ مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں ناقابلِ تصور پیمانے پر دھاندلیاں کرائیں اور جس یقین کے ساتھ اس نے ان دھاندلیوں کے خلاف ابھرنے والی عوامی تحریک کو کچلنے کا پروگرام بنایا۔ وہ اعتماد اور یقین بھارت کے عام انتخابات میں اندرا گاندھی کی غیر متوقع شکست کی وجہ سے پاش پاش ہو گیا۔ پاک فوج کو بلیک میل کرنے اور اسے عوام کی حمایت سے باز رکھنے کے لئے اس کے پاس جو مؤثر ہتھیار تھا وہ اس سے چھن چکا تھا۔

○ ○

بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لئے بھٹو نے ایک بڑا ہی جامع منصوبہ بنایا شملہ سمجھوتے کے بعد سرکاری پروپیگنڈہ مشینری بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے فوائد عوام پر ظاہر کرنے کے لئے پوری طرح حرکت میں آ چکی تھی۔ اسی دوران متعدد مرتبہ حکومت نے یہ تاثر دیا کہ وہ بنگلہ دیش کو بس تسلیم کرنے ہی والی ہے چنانچہ بھٹو کی توقعات کے مطابق اپوزیشن کی بعض جماعتوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے فیصلے کے خلاف عوامی تحریک چلانے کا عزم کیا۔ لاہور میں طلباء نے

مظاہرے بھی کئے۔ مگر ایک ایسے فیصلے کے خلاف عوام میں غم و غصہ اور جوش و خروش پیدا ہونے کا امکان بہت کم تھا جس کا کوئی اعلان نہیں ہوا تھا۔ جب بھی بنگلہ دیش کے مسئلے پر عوامی جذبات میں شدت پیدا ہونے کا امکان ہوتا تو بھٹو فوراً یہ مؤقف اختیار کر لیتا کہ فی الحال یہ مسئلہ حکومت کے زیر غور رہے ہی نہیں۔ چنانچہ عوامی جذبات سرد پڑ جاتے۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ جس کا مقصد عوام کے جذبات سے آنکھ مچولی کھیلنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس آنکھ مچولی سے عوام بالآخر تنگ آ گئے اور سقوطِ مشرقی پاکستان اور قیام بنگلہ دیش کے بارے میں ان کے جو احساسات تھے وہ کمزور پڑ گئے۔ اس مرحلے پر بھٹو نے اپنے آپ کو ایک عظیم "مسلم قوم پرست" اور مسلم اتحاد کا ایک "نڈر نقیب" ثابت کرنے کے لئے لاہور میں منعقد ہونے والی مسلم سربراہی کانفرنس کو بھرپور طریقے سے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ بھٹو کے برسر اقتدار آنے سے دو برس قبل رباط میں مسلم سربراہوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں جنرل یحییٰ خان نے تجویز پیش کی تھی کی دوسری مسلم سربراہی کانفرنس منعقد کرانے کا اعزاز پاکستان کو دیا جائے اس تجویز کو متفقہ طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ جب اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا تو پاکستان کی باگ ڈور بھٹو کے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ بھٹو کے اخلاقی دیوالیہ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے اس اتفاق کو اپنا عظیم ترین کارنامہ ثابت کرتے وقت کوئی شرمندگی محسوس نہ کی۔ اس کا اصل کارنامہ تو یہ تھا کہ اس کانفرنس کی آڑ میں مسلم اتحاد کے نام پر اس نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ اس سلسلہ میں اس نے عالم اسلام کے بعض ایسے لیڈروں کی حمایت حاصل کر لی تھی جنہیں پاکستان کے عوام احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان لیڈروں کی نگاہوں میں پاکستان بھی ایک مسلم ملک تھا اور بنگلہ دیش

بھی ایک مسلم ملک تھا لہٰذا دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کا قیام بے حد ضروری تھا۔ یہ بات انہیں صرف بھٹو سمجھا سکتا تھا کہ مسئلہ دو مسلم ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کا نہیں اس دو قومی نظریہ کا ہے جس کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا تھا اور جسے غلط ثابت کرنے کے لئے بھارت نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کی سازش میں مرکزی کردار ادا کیا۔ بھارت نے دو قومی نظریہ پر کاری وار کرنے کے لئے بنگلہ دیش کے قیام کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ ۱۹۴۷ء میں قائم ہونے والا پاکستان ایک قوم یعنی مسلم قوم کا وطن نہیں تھا۔ اگر پاکستان ایک قوم یعنی مسلم قوم کا وطن ہوتا تو بنگلہ قوم پرست تحریک کے نتیجے میں بنگلہ دیش قائم نہ ہوتا۔ بھٹو مسلم سربراہوں کو بتا سکتا تھا کہ بنگلہ دیش کے عوام اور پاکستان کے عوام بنیادی طور پر ایک ہی قوم ہیں۔ وہ قوم جس نے اپنی قومیت کو تسلیم کراتے کے لئے ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کے خلاف تاریخی جدوجہد کی تھی۔ اس لئے بنگلہ دیش کو ایک الگ قوم کے وطن کے طور پر تسلیم کرنے کا مطلب نظریۂ پاکستان سے غداری ہوگی۔ بھٹو مسلم دنیا کے رہنماؤں سے کہہ سکتا تھا کہ باہمی غلط فہمیوں اور بھارتی جارحیت کے نتیجے میں قائم ہونے والے بنگلہ دیش کو جلد یا بدیر اپنی حقیقی قومیت کی طرف واپس آنا ہی پڑے گا اور پاکستان کے عوام بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی بجائے اس وقت کا انتظار کرنا پسند کریں گے جب مسلم قومیت کا نظریہ دوبارہ کامرانی سے ہمکنار ہوگا۔

لیکن بھٹو تو خود بنگلہ دیش کا خالق تھا اور اس نے مسلم سربراہی کانفرنس کو غیر معمولی پبلسٹی ہی اس مقصد کے لئے دی تھی کہ کرنل قذافی جیسے رہنماؤں کی مقبولیت کو ڈھال بنا کر اہل لاہور کے سامنے بنگلہ دیش کو تسلیم کرے۔

وہ دن اہل لاہور کے لئے شرم سے ڈوب مرنے کا دن تھا۔ جب قذافی

سٹیڈیم میں مشرقی پاکستان کا نام صفحۂ ہستی سے مٹایا جا رہا تھا۔ جب بھٹو اور بھارت کی سازش کے نتیجے میں قائم ہونے والے بنگلہ دیش کو کرنل قذافی کی زبان آئینی تقدس عطا کر رہی تھی۔ اس روز میری قومی غیرت بھی سو گئی تھی کہ میں اٹھ کر قذافی سے یہ نہ کہہ سکا "تم دنیائے اسلام کے ایک قابلِ فخر فرزند ہو۔ اہلِ پاکستان تم سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ کم از کم تم تو یہ نہ کہو کہ مسلم قومیت کا نظریہ غلط تھا اور اس نظریئے کی بنیاد پر قائم ہونے والا پاکستان غلط تھا۔ کم از کم تم تو یہ نہ بتاؤ کہ ہمیں اپنی شکست کی دستاویز پر دستخط کر دینے چاہیئیں۔ یہ مکار شخص جو تمہارے پہلو میں کھڑا مسکرا رہا ہے اسے تم اپنا بھائی مت کہو، یہ پاکستان کا قاتل ہے، اس نے مسندِ اقتدار تک پہنچنے کی ہوس میں ہمارے پاکستان کو غداری کے خنجر سے ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے۔ تم پاکستان کے قاتل کو اپنا بھائی کہہ کر ہماری ہی نہیں اپنی بھی توہین کر رہے ہو"

○ ○

۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھٹو نے پاکستان کے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو اس کے ذہن میں یہ خدشہ موجود تھا کہ اگر اس نے اپنی حکومت کو جلد از جلد آئینی حیثیت نہ دی تو اس کے سیاسی مخالفین سقوطِ مشرقی پاکستان کے صدمے سے سنبھلنے کے بعد اس کے حقِ اقتدار کو چیلنج کریں گے اور نئے عام انتخابات کے لئے تحریک چلائیں گے۔ اسے معلوم تھا جن عام انتخابات کے نتائج کی بنیاد پر اس نے اقتدار سنبھالا تھا وہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد خود بخود کالعدم ہو چکے تھے اور اس کے سیاسی مخالفین نئے حالات میں نئی قومی اسمبلی کی تشکیل کے لئے نئے عام انتخابات کا مطالبہ کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب

ثابت کر سکتے تھے ۔ چنانچہ اس نے چند اقدامات ایسے کئے جن سے یہ تاثر قائم ہو کر وہ اپنی پارٹی کی زبردست اکثریت سے فائدہ اٹھا کر کمزور حزب اختلاف کو عضو معطل بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ۔ اس نے نیپ پر سے وہ پابندی اٹھالی جو جنرل یحییٰ خان نے لگائی تھی اور اعلان کیا کہ وہ ایسا آئین نافذ کرنا چاہتا ہے جسے تمام پارٹیوں کے منتخب عوامی نمائندوں کی حمایت حاصل ہو اور اس مقصد کے لئے وہ حزب اختلاف سے پرخلوص اور بامقصد مذاکرات کرنا چاہتا ہے ۔ اس نے جو عبوری آئین نافذ کیا اس میں صوبائی گورنروں کو تمام انتظامی اختیارات دیئے گئے تھے ان صوبائی گورنروں کو اس نے خود اپنی مرضی سے نامزد کیا تھا ۔ اس کا موقف یہ تھا کہ جب تک مستقل آئین عبوری آئین کی جگہ نہیں لیتا اس وقت تک صوبوں میں اقتدار وہاں کی اکثریتی پارٹیوں کو منتقل نہیں کیا جا سکتا ۔ سرحد اور بلوچستان میں خان ولی خان کی نیپ اور مفتی محمود کی جمعیت العلمائے اسلام کو اکثریت حاصل تھی اور یہ دونوں منجھے ہوئے سیاست دان سرحد اور بلوچستان میں اپنی متحدہ قوت کا حق اقتدار منوانے کے لئے بھٹو کے دام میں آگئے ۔ حزب اختلاف کی دوسری جماعتیں بھی اس امید پر آئین سازی کے کام میں بھٹو کے ساتھ اشتراک کرنے پر آمادہ ہو گئیں کہ اس طرح حکومت کم از کم وہ لامحدود اختیارات تو استعمال نہیں کر پائے گی جو مارشل لا اور عبوری آئین کے تحت اسے حاصل تھے ۔ جہاں تک خان عبدالقیوم خان کا تعلق تھا تو وہ اپنی دیرینہ روایات کے مطابق طاقتور حاکم کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے تھے ۔ دولتانہ نے بھی برطانیہ میں بھٹو کے سفیر کی حیثیت سے اپنی باقیماندہ زندگی سکون اور اطمینان کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا ۔ بھٹو نے ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کے دوران نظریۂ پاکستان کے ان ہی دو دعویداروں کو سب سے زیادہ تضحیک اور تمسخر کا نشانہ بنایا تھا ۔ ان دو موقع پرستوں نے موقع شناسی سے کام لے کر اس شخص کی اطاعت

قبول کرلی تھی جس نے انہیں "ڈبل بیرل" اور "پوہا" جیسے خطابات سے نوازا تھا
صرف اصغر خاں ایسے قومی رہنما تھے جنہوں نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ
بھٹو کے ساتھ آئین کے مسئلہ پر مذاکرات کرنے کا مطلب اس کی غیر آئینی حکومت
کو آئینی حیثیت دینا ہو گا۔ اصغر خاں کا موقف یہ تھا کہ بھٹو ایک سازش کے ذریعے
ملک کو توڑ کر برسراقتدار آیا ہے۔ اس لئے اسے حکومت کرنے اور آئین بنانے کا کوئی حق
نہیں۔ جس قومی اسمبلی کو آئین سازی کا اختیار حاصل تھا اس میں بھٹو پارٹی اقلیت
میں تھی اب ملک کے ٹوٹنے کے ساتھ وہ قومی اسمبلی بھی ٹوٹ چکی ہے۔ چنانچہ قانونی
حکومت قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بلا تاخیر فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں نئے
عام انتخابات کرائے جائیں۔ نئے عام انتخابات کے نتیجے میں قائم ہونے والی قومی
اسمبلی کو ہی یہ اختیار حاصل ہو گا کہ ملک کو مستقل آئین دے"۔

اصغر خان نے حزب اختلاف کو یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ بھٹو کو اگر آئین
بنانے کا موقع دیا گیا تو وہ اپنی پارٹی کی بھاری اکثریت کی بنیاد پر آئین میں حسب ضرورت
اور حسب منشا ترامیم کرلیا کرے گا۔ اس لئے اگر مذاکرات کے نتیجے میں ایسا آئین تیار
ہو بھی گیا جسے حزب اختلاف کی منظوری حاصل ہو تو بھی بھٹو اپنے آپ کو آئین کا پابند
بنانے پر مجبور نہیں ہو گا۔

بعد میں پیش آنے والے واقعات و حالات نے ثابت کر دیا کہ اصغر خان نے بھٹو
کے عزائم کا صحیح تجزیہ کیا تھا۔ لیکن اس وقت اپوزیشن کے لیڈر بھٹو سے اپنے مطالبات
منوا کر یہ ثابت کرنے کے موڈ میں تھے کہ انہوں نے اقلیت میں ہونے کے باوجود
ملک پر جمہوری اقدار اور بنیادی حقوق کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ بھٹو کے ساتھ
مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں قدرت نے اپنی مدبرانہ صلاحیتوں
کے بھرپور اظہار کا بڑا ہی شاندار موقع عطا کیا ہے۔ انہوں نے جو بھی مطالبات کئے بھٹو

کے اندازوں کے مطابق تھے۔ بھٹو نے جان بوجھ کر ابتدا میں سخت رویہ اختیار کیا تاکہ جب وہ بالآخر اپوزیشن کے مطالبات کو بعض ترامیم کے ساتھ قبول کرے تو ایک طرف تو بھٹو کی جمہوریت پسندی کی دھاک بیٹھ جاتے اور دوسری طرف اپوزیشن کے رہنما بھٹو کے آئین کو اپنا کارنامہ قرار دیں۔ آئین بنیادی طور پر بھٹو کا ہی تھا کیوں کہ اس میں ترمیم کرنے کے لیئے جتنی اکثریت کی ضرورت تھی اس سے کہیں زیادہ اکثریت پیپلز پارٹی کو حاصل تھی۔ اس لیئے اگر بھٹو کے سامنے اور بھی زیادہ سخت مطالبات رکھے جاتے اور اپوزیشن کے لیڈران مطالبات کو منوانے کا تہیہ کر لیتے تو بھی بھٹو انہیں مایوس نہ کرتا۔ آئین میں حسب ضرورت اور حسب منشا ترامیم کرنے کی قوت تو بہر حال بھٹو کو حاصل تھی۔

جس روز بھٹو کے آئین پر اپوزیشن کے نمائندوں نے دستخط کیئے اس روز پیپلز پارٹی کی غیر آئینی حکومت کو آئینی حیثیت حاصل ہو گئی اور اس کے بعد بھٹو ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز ہو گیا۔

نیپ اور جمعیت العلمائے اسلام کو سرحد اور بلوچستان میں حق اقتدار تو حاصل ہو گیا تھا لیکن جس سازشی ذہن نے فوج کو مشرقی پاکستان سے ٹکرا دیا تھا اس کے لئے سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کو سازشوں کے جال میں جکڑنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ پنجاب کے عوام کو ایک بار پھر "ملکی سالمیت خطرے میں ہے" کے نعرے سے خوفزدہ کیا گیا۔ لندن پلان کا شوشہ چھوڑا گیا۔ عراقی سفارت خانے سے ایسا اسلحہ برآمد کرایا گیا جسے علیحدگی پسند اور ملک دشمن عناصر پاکستان کی "سالمیت" کے خلاف استعمال کرنے والے تھے۔ لس بیلہ میں خانہ جنگی کرائی گئی تاکہ بلوچستان میں فوجی مداخلت کا جواز پیدا کیا جا سکے بالآخر بلوچستان کی حکومت معزول کر دی گئی اور وہاں گورنر راج کے نفاذ کے ساتھ ممتاز بلوچ لیڈروں کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ سرحد میں مفتی محمود کو بڑے

بڑے لالچ دے کر نیپ سے الگ راستہ اختیار کرانے کی ناکام کوشش کی گئی اور اس کے بعد وہاں کی اکثریتی پارٹیوں کی حکومت کو بھی ختم کر دیا گیا۔ چند ہی ماہ میں دھونس دھاندلی اور لالچ کے ذریعے سرحد اور بلوچستان میں بھی پیپلز پارٹی کو اکثریتی جماعت بنایا جا چکا تھا۔

بھٹو کی وحشیانہ ہوسِ اقتدار ایک بار پھر ملک کو خانہ جنگی کی طرف لے جا رہی تھی۔ اگر خان ولی خان بھی شیخ مجیب الرحمان کی طرح طیش میں آکر پختون حقوق کی بحالی کی جنگ شروع کر دیتے تو قائد اعظم کے بچے کھچے پاکستان میں بھی آگ اور خون کا کھیل شروع ہو جاتا۔ لیکن خان ولی خان نے ہوشمندی سے کام لے کر اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔ بھٹو نے ایف ایس ایف کے ذریعے مختلف شہروں میں بموں کے دھماکے کرا کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نیپ نے سالمیت پاکستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ مگر خان ولی خان نے اشتعال میں آنے سے انکار کر دیا۔

بھٹو کو نیپ پر پابندی لگانے کے لئے ایک مضبوط جواز کی ضرورت تھی اور یہ جواز اس نے شیر پاؤ کے قتل کے ذریعے حاصل کر لیا۔ خان ولی خان اور نیپ کے دوسرے لیڈر بالآخر غداری اور ملک دشمنی کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے اور بھٹو بلا شرکتِ غیر پاکستان کی قسمت کا مالک بن گیا۔ اب تاحیات حکومت کرنے کے خواب کی تکمیل دور نہیں تھی راستے میں اب صرف ایک بڑا پتھر تھا جسے ہٹانے کے لئے بھٹو کو مناسب وقت کا انتظار تھا اس نے اپنے ایک قریبی ساتھی سے کہا تھا۔

" اگر میں اصغر خان کا صفایا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اگلی ربع صدی تک دنیا کی کوئی طاقت مجھے اقتدار سے الگ نہیں کر سکے گی"۔

لیکن بھٹو اصغر خان کا صفایا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور آج وہ حاکمِ پاکستان ہونے کی بجائے حکومتِ پاکستان کا قیدی ہے۔

بھٹو کے دورِ اقتدار میں عدلیہ کے وقار کو جس دیدہ دلیری کے ساتھ پائمال کیا گیا اور قانون کی حفاظت کرنے والے اداروں نے جس بے رحمی کے ساتھ قانون کی عصمت دری کی اس کا تفصیلی ذکر یہاں میں اس لئے نہیں کروں گا کہ بھٹو اور اس کے ٹولے کے جرائم اس وقت زیر تفتیش ہیں اور ملک کی اعلیٰ عدالتیں جرم و سزا کی تاریخ میں ایک ایسا باب لکھنے میں مصروف ہیں جس پر آنے والی حکومتوں اور نسلوں کے کردار کا انحصار ہو گا۔ میرا مقصد ویسے بھی بھٹو کے دور کی تاریخ لکھنا نہیں۔ یہ کام کسی مورخ کا ہے جو کیلنڈر سامنے رکھ کر واقعات کی کڑیاں آپس میں ملاتے۔ میرے سامنے کوئی کیلنڈر نہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میں ایک ہولناک رات میں سے گذر کر آیا ہوں جس کا آغاز ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا تھا اور جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو ختم ہوئی۔ اس طویل رات کے دوران بھٹو کے غنڈوں نے خواجہ رفیق کو قتل کیا۔ ڈاکٹر نذیر کو قتل کیا، احمد رضا قصوری پر گولیاں برسائیں جو خود تو بچ گئے لیکن اپنے باپ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس طویل رات کے دوران مولوی شمس الدین قتل ہوئے، شیر پاؤ قتل ہوئے، مزدور قتل ہوتے، طالبعلم قتل ہوتے۔ اصول قتل ہوتے، قوانین قتل ہوتے۔ انسانی رشتے قتل ہوتے اس طویل رات کے دوران بھٹو کے غنڈوں کے ہاتھوں سے بھٹو کو دیوتا بنانے والے پجاری بھی نہ بچ سکے۔ جے اے رحیم جیسے بزرگ سیاست دانوں کو وحشت و بربریت کا نشانہ بنایا گیا۔ معراج محمد خان جیسے وفادار ساتھی پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر غلام حسین نے اپنے ضمیر میں جان ڈالنے کی کوشش کی تو انہیں الٹی میٹم دیا گیا کہ اگر وہ بارہ گھنٹوں کے اندر اندر راست پر نہ آئے تو ان کی بیٹیوں کو تھانوں میں لے جا کر تختۂ مشق بنایا جائے گا۔ حنیف رامے نے پنجاب پر کی جانے والی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کیا تو ان پر سنگینیں تان دی گئیں۔

اس طویل رات کے دوران صرف ان وفادار کتوں کو "باعزت" زندگی گزارنے کا حق حاصل تھا جو بھٹو کے پاؤں چاٹنے اور دم ہلانے کا فن جانتے تھے۔ کوثر نیازی نے دین کے محاذ پر حقِ وفاداری ادا کیا اور کروڑپتی بن گیا۔ شیخ رشید نے سوشلزم کے محاذ پر وفاداری کی اعلیٰ روایات قائم کیں اور دولت کمائی، عبدالحفیظ پیرزادہ ممتاز بھٹو، ناصر رضوی، جام صادق، خالد ملک اور ایسے درجنوں طالع آزماؤں نے اپنے آپ کو تمام قوانین، اصولوں اور ضابطوں سے آزاد کرا لیا۔ ملک کی دولت کو جی بھر کے لوٹا گیا۔ ضمیروں اور عصمتوں کے سودے بڑی فیاضی کے ساتھ ہوئے خوب صورت بیویاں یا بیٹیاں بے شمار بے غیرتوں کی ترقی و خوشحالی کی ضمانت بن گئیں۔ قلم کی جگہ انگوٹھا استعمال کرنے والوں کو اعلیٰ اور با اختیار عہدے نصیب ہوتے۔ غنڈوں کو وردیاں پہنا دی گئیں اور احتجاج کی آواز بلند کرنے والوں کا مزاج درست کرنے کے لئے ان باوردی غنڈوں کو جبر و تشدد کے تمام آلات سے لیس کر دیا گیا۔

اس طویل رات کے اندھیروں نے قوم کے انفرادی و اجتماعی کردار کو ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے دیکھا۔ بھٹو کا فلسفہ یہ تھا کہ قوم کو تمام اخلاقی اقدار سے محروم کئے بغیر کمزور نہیں بنایا جا سکتا اور جو قوم کمزور نہ ہو اس کا حاکم اسے طاقت سے مغلوب نہیں کر سکتا۔ بھٹو نے قوم کو چار طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک طبقہ جاگیرداروں کا تھا۔ جو اس کا اپنا طبقہ تھا اور جس کی طاقت میں اضافہ کر کے وہ باقی طبقوں پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا طبقہ صنعت کاروں کا تھا جس کی طاقت کو وہ اپنے لئے خطرہ تصور کرتا تھا۔ اسی لئے اس نے صنعت کا پہیہ جام کرنے کیلئے سوشلزم کا سہارا لیا۔ ایوب خان کے دور میں پاکستان نے صنعتی لحاظ سے جو غیر معمولی ترقی کی تھی اس کی وجہ سے صنعت کار قومی سیاست میں جاگیرداروں

پر حاوی ہو گئے تھے۔ بھٹو نے صنعت کاروں کو کچل کر جاگیرداروں کی سیاسی اجارہ داری دوبارہ قائم کر دی۔ یہ کوئی اتفاق نہیں کہ سندھ اور پنجاب کے گورنر اور وزیر اعلیٰ سب نواب تھے۔ (غلام مصطفےٰ جتوئی کے پاس اتنی زمینیں اور جاگیریں ہیں کہ اگر انہیں عوام میں تقسیم کیا جائے تو کم از کم دس ہزار خاندان خوش حال ہو سکتے ہیں)۔ بلوچستان کا گورنر بھی نواب اور وزیر اعلیٰ بھی نواب تھا۔ خود بھٹو کے پاس کتنی بڑی جاگیر ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سال کی فصل کا دھان اس نے رائس ملنگ کارپوریشن کو ۴۰ لاکھ روپے میں فروخت کیا۔ گویا بھٹو کی زمینوں کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ روپے کے لگ بھگ ہو گی۔ ان حقائق سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ زرعی اصلاحات کے فراڈ نے پیپلز پارٹی کے جاگیرداروں کو کسی طرح بھی متاثر نہیں کیا۔

دوسرے دو طبقوں میں ایک ان پڑھ اور بے شعور محنت کشوں کا طبقہ اور دوسرا پڑھے لکھے اور باشعور محنت کشوں کا طبقہ تھا ان پڑھ اور بے شعور محنت کشوں کے جذبات کو ایکسپلائٹ کرنا بھٹو کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ طبقہ تعلیم کے فقدان اور جہالت کی وجہ سے اپنے معاشی مسائل کو قوم کے اجتماعی مفادات سے ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت سے عاری تھا۔ اس طبقے کو بھٹو نے یہ سبز باغ دکھایا کہ حکومت دراصل اسی کی ہے۔ اور پیپلز پارٹی کے جاگیردار دراصل اسی کے نمائندے ہیں۔ اس طبقے کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ پیداوار میں مسلسل بڑھتی ہوئی کمی کی وجہ سے قومی خزانہ مسلسل خالی ہو رہا ہے اور ملک بڑی تیزی کے ساتھ دیوالیہ پن اور تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ اس طبقے کو صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ اسے کیا مل رہا ہے اور بھٹو نے اسے خوش رکھنے کے لئے بے شمار غیر پیداواری منصوبے شروع کئے۔ غیر ممالک سے قرضے لا کر ان منصوبوں

کو سرمایہ فراہم کیا گیا اور یہ سرمایہ بڑی حد تک تو پیپلز پارٹی کے جاگیرداروں اور ان کے ایجنٹوں کی جیبوں میں گیا، لیکن کچھ نہ کچھ ان محنت کشوں کے حصے میں بھی آیا جنہیں اس بات کا قطعاً کوئی شعور نہیں تھا کہ جو کچھ انہیں دیا جا رہا ہے اس کی قیمت پاکستان کی آنے والی نسلوں کو ادا کرنی پڑے گی۔ جب بھٹو نے اقتدار سنبھالا تو غیر ملکی قرضوں کی کل رقم ۵۵ ارب روپے تھی۔ یہ قرضے بیس برس میں حاصل کئے گئے تھے۔ بھٹو نے صرف پانچ برس میں پاکستان کو مزید ۴۹ ارب روپے کا مقروض بنا دیا اور اس رقم کا بیشتر حصہ ایسے منصوبوں پر خرچ کیا گیا جو قطعی طور پر غیر پیداوری تھے اور جن کی بدولت روزگار کے جو مواقع پیدا کئے گئے وہ قطعی طور پر عارضی تھے۔ ان منصوبوں کی بدولت محنت کشوں کو عارضی طور پر تو کچھ نہ کچھ خوشحالی حاصل ہوئی لیکن دیرپا فائدے جاگیرداروں اور افسر شاہی نے حاصل کئے۔ مفاد پرست عناصر کے گھروں میں اچانک دولت کی ایسی ریل پیل ہوئی کہ جو کبھی بیس ہزار کی ایک کار نہیں خرید سکتے تھے۔ انہوں نے ایک ایک دو دو لاکھ کی تین تین چار چار کاریں خرید لیں۔ بڑے پیمانے پر نئی جائیدادیں بنائی گئیں اور بھٹو اس کھیل کو جاری رکھنے کے لئے دھڑا دھڑ غیر ملکی قرضے حاصل کرتا رہا اور کروڑوں کی تعداد میں نوٹ چھاپ چھاپ کر مارکیٹ میں لاتا رہا۔

اس بڑھتی ہوئی افراطِ زر اور گرتی ہوئی پیداوار کی زد میں وہ پڑھا لکھا اور باشعور محنت کش طبقہ آیا جسے بھٹو ہر قیمت پر کچلنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے بھٹو کے پاس ایک بڑی ہی مؤثر تھیوری تھی وہ سمجھتا تھا کہ ہر فرد کی ایک قیمت ہوتی ہے اور اس فرد کو اس قیمت پر خریدا جا سکتا ہے۔ جب کوئی فرد بک جائے تو وہ احساسِ جرم میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی اخلاقی جرأت

ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بھٹو نے صحافیوں کو خریدا، ججوں کو خریدا، افسروں کو خریدا، وزیروں کو خریدا، سیاست دانوں کو خریدا اور مزدوروں اور مزدور لیڈروں کو خریدا، جو بکتے چلے گئے ان کی فائلیں بن گئیں اور ان میں کوئی بھی اس پوزیشن میں نہ رہا کہ کسی بھی موقع پر سر اٹھا سکے اور جو بکنے کے لئے تیار نہ ہوتے انہیں وحشیانہ جبر و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ انہیں بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ ان پر باعزت زندگی گزارنے کے دروازے بند کر دیئے گئے۔

بھٹو کے کردار کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لئے میں دو مثالیں دے رہا ہوں۔

گزشتہ دنوں میری ملاقات سرحد ہائیکورٹ کے ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس سے ہوئی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں بتایا۔

ایک مرتبہ اسلام آباد میں میری طلبی ہوئی۔ بھٹو بڑے اچھے موڈ میں تھا اس نے کہا۔ جج صاحب آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مجھ سے مانگیے۔ میں نے اس سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے اس لئے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بھٹو مسکرا کر بولا۔ آپ تکلف کر رہے ہیں، ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو بے شمار چیزوں کی ضرورت محسوس ہو گی۔ وہ سب کچھ آپ آج مجھ سے حاصل کر سکتے ہیں۔"

اس صاحب ضمیر چیف جسٹس نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔ چنانچہ اسے چند ہی ماہ بعد ریٹائرڈ کر دیا گیا۔

دوسری مثال ایک ایسے شاعر صحافی اور دانشور کی ہے۔ جس نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو سندھ کی صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ انتخابی مہم کے دوران اس نے عوام کا موڈ دیکھ کر اپنی ہائی کمان کو کچھ مشورے لکھ بھیجے جو ہائی کمان

کو ناگوار گزرے ۔ اس امیدوار کے گھر پر ایف ایس ایف کا پہرہ رہتا تھا کیوں کہ ان دنوں پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے اصحاب عوام کے جوش و خروش سے بہت ڈرتے تھے ۔ ایک روز جب یہ امیدوار اپنے گھر پر موجود نہیں تھا تو حفاظت کے لئے مامور باوردی غنڈوں نے اس کی بیٹی کی عصمت لوٹ لی ۔

اس شاعر صحافی اور دانشور نے اس ہولناک واقعہ پہ ہائی کمان سے احتجاج کیا تو اسے جواب ملا ۔

" تم ایف ایس ایف اور پیپلز پارٹی کو بدنام کرنا چاہتے ہو ۔ یہ بات برداشت نہیں کی جائے گی ۔ تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ منہ بند رکھو "۔

بھٹو ملک میں جو نظام قائم کرنا چاہتا تھا اس کا اندازہ ان دو مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے ۔ یہاں مجھے ایک اور بات بھی یاد آ رہی ہے ۔ اس بات کا علم مجھے ایک ایسے ذریعے سے ہوا جس کے باوثوق ہونے میں مجھے کوئی شبہ نہیں ۔

اپنے اقتدار کے ابتدائی مہینوں میں بھٹو نے پنجاب ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج کی خدمات حاصل کیں اور اس کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ عدلیہ سے تعلق رکھنے والے تمام اصحاب کے کردار و اعمال کے بارے میں حقائق جمع کرے اور ان حقائق کی روشنی میں مفصل رپورٹ تیار کر کے حکومت کو پیش کرے تاکہ عدلیہ کو بدعنوان عناصر سے پاک کیا جا سکے ۔ اس ریٹائرڈ جج نے بڑی محنت سے مطلوبہ حقائق حاصل کئے اور ایک جامع رپورٹ حکومت کو بھیج کر عدلیہ کی تطہیر کا انتظار کرنے لگا ۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ خبر آئی کہ اس کی رپورٹ کے مطابق جو شخص سب سے زیادہ سنگین بدعنوانیوں کا مرتکب ہوا تھا اسے ترقی دے کر چیف جسٹس مقرر کر دیا گیا ہے ۔

یہ تمام باتیں لکھنے کے بعد میں آخر میں پھر اس محنت کش طبقے کا ذکر کرنا چاہتا

ہوں جس کی جہالت اور بے شعوری پر بھٹو نے اپنے اقتدار کی عمارت کھڑی کی۔ اس طبقے کو خوش کرنے کے لئے بھٹو نے اس سے محنت کی عظمت کا احساس چھین لیا اور اسے یہ یقین دلایا کہ اسے محنت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی خوشحالی کی ضمانت اسی بات سے مل جاتی ہے کہ وہ بھٹو کو قائد عوام سمجھتا ہے اور پیپلز پارٹی کے ساتھ وفاداری کا دم بھرتا رہے۔ قومیائی ہوئی صنعتوں کارخانوں اور اداروں میں ہزاروں ایسے "محنت کش" بھرتی کئے گئے، جن کا کام پیپلز پارٹی کے جلسوں کی رونق بڑھانا اور ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو دفتر جا کر تنخواہیں وصول کرنا تھا۔ ان نام نہاد "محنت کشوں" کو محنت کے بغیر محنت کی اُجرت حاصل کرتے دیکھ کر وہ لوگ بھی جو حقیقی معنوں میں محنت کش تھے۔ محنت سے جی چرانے لگے اور قومی پیداوار میں اتنے بڑے پیمانے پر کمی ہونے لگی کہ اگر بھٹو چند برس اور برسر اقتدار رہتا تو پاکستان اقتصادی طور پر بالکل تباہ ہو جاتا۔ غیر ملکی قرضوں اور ارب ہا روپے کے فالتو کرنسی نوٹوں کے ذریعے آخر کب تک اس معاشی تباہی کو روکا جا سکتا تھا جو قومی پیداوار میں روز افزوں کمی اور غیر پیداواری اخراجات میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے قریب تر آ رہی تھی؟۔

---

# جنرل ضیاء الحق

# کے لئے چیلنج

"جو شخص سچا سپاہی نہ ہو وہ سچا مسلمان بھی نہیں ہو سکتا۔ ہماری تو پوری تاریخ سپاہیوں نے اپنے خون سے لکھی ہے۔ کیا صلاح الدین ایوبیؒ سپاہی نہیں تھے؟ کیا ٹیپو شہیدؒ سپاہی نہیں تھے؟ کیا اورنگ زیبؒ سپاہی نہیں تھے؟ اور کیا ہماری تاریخ کے ان عظیم سپاہیوں کے پاس دماغ نہیں تھا؟

پچھلے ابواب میں ہفت روزہ اشتراک کا ذکر ہو چکا ہے۔ وہ اشتراک جو میری امنگوں کا عکاس تھا اور جسے میں پوری قوم کے ولولوں کا نقیب اور تحریکِ مسلم نشاۃ ثانیہ کا پیغام بنانا چاہتا تھا۔ لیکن میرے وسائل میرے عزائم کا ساتھ نہ دے سکے اور قلیل اشاعت کی وجہ سے میرے اس جریدے کی آواز ان لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچ سکی جو میری ہی طرح احساسِ شکست کی زنجیریں توڑ کر پاکستان کی فضاؤں میں عزم و ایمان کی نئی قندیلیں روشن کرنا چاہتے تھے۔ پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور اشتراک کو زندہ رکھنے کی بھرپور جد و جہد کی۔ جب تک اشتراک زندہ رہا میں اس جرم کا کفارہ ادا کرتا رہا جو میں نے بھٹو کو ووٹ دے کر کیا تھا۔ میں نے جھوٹ کے اس پیغمبر۔ فراڈ کے اس دیوتا۔ اندرا گاندھی کے اس منظورِ نظر اور مسلم قوم پرست تحریک کے اس دشمن کو ہر ممکن طریقے سے بے نقاب کیا۔ میں نے لکھا۔

"ہم بنگلہ دیش کے خالق پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اب قوم اسے کسی نئے بنگلہ دیش کی تخلیق کی سازش نہیں کرنے دے گی۔"

میں نے لکھا۔

"شری بھٹو بے شک شریمتی اندرا گاندھی سے دوستی کریں۔ لیکن اہلِ پاکستان شکست کے اس داغ کو دھونے کے لئے کسی ایسے بطلِ جلیل کا انتظار کریں گے جو

ملی غیرت کی لاش پر میلے اور جشن منانے کی بجائے صلاح الدین ایوبیؒ کی قائم کردہ روایات کی مشعل بلند کرے گا۔"

میں نے لکھا۔

"جناب بھٹو برصغیر میں امن چاہتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں خواجہ رفیق اور ڈاکٹر نذیر جیسے لوگ قتل ہوتے رہیں گے کہ قائد عوام کی جمہوریت میں صرف غنڈوں کو سر اٹھا کر چلنے کی اجازت ہو گی۔ سنا ہے کہ بھٹو تاریخ کے طالبعلم ہیں۔ اگر واقعی انہوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ ہر نمرود کیلئے ابراہیمؑ اور ہر فرعون کے لئے موسیٰؑ پیدا کرتا ہے۔"

میں نے لکھا۔

"کچھ لوگ بھٹو کے عوامی دور کا موازنہ ہٹلر کے نازی دور سے کرتے ہیں۔ لیکن ہم اسے ہٹلر کی توہین تصور کرتے ہیں۔ وہ جتنا بڑا مجرم تھا اتنا ہی بڑا وطن پرست بھی تھا۔"

میں نے لکھا۔

"پھر کب تک حاکم اور انسان کب تک محکوم رہیں گے؟ ظلمت کی یہ رات کب ختم ہو گی؟ اہل پنجاب کی غیرت کب جاگے گی؟ غداروں کا یوم حساب کب آئے گا؟"

میں نے لکھا۔

"وطن عزیز کی مقدس سرحدوں کے حیالے محافظوں کو بھارتی کیمپوں سے رہائی دلا کر بھٹو نے مسلم قوم پر واقعی بہت بڑا احسان کیا ہے، لیکن ہم انہیں یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ وہ جو میجر عزیز بھٹی شہید اور میجر عباسی شہید کی روایات کے امین ہیں۔ ان کے دلوں میں رہائی کی امنگ نہیں تھی انتقام کی امنگ تھی۔"

میں نے بہت کچھ لکھا۔ اتنا کچھ لکھا کہ مجھے حیرت ہے کہ بھٹو نے اشتراک کو ایک سال تک زندہ کیوں رہنے دیا۔ بالآخر اشتراک کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا گیا اور لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے مجھے بلا کر کہا کہ اگر میں نے اس سلسلہ میں عدالتی چارہ جوئی کی تو مجھے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ پیش کش کی گئی کہ اگر میں اپنی پالیسی کو تبدیل کر لوں اور اصغر خاں کے خلاف ایک بیان پر دستخط کر دوں تو نہ صرف یہ کہ اشتراک کا ڈیکلریشن بحال کر دیا جائے گا۔ بلکہ مجھے فراخدلانہ مالی امداد بھی مہیا کی جائے گی۔

مجھ میں اتنی جرأت تو نہیں تھی کہ "سنگین نتائج" کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جاتا لیکن اتنی جرأت ضرور تھی کہ حکومت کی پیش کش کو مسترد کر دوں۔

قلم سے ضمیر کا رشتہ برقرار رکھنا میرے وسائل اور میری پہنچ سے باہر ہو گیا تھا، لیکن قلم سے رشتہ توڑ کر صحافت کو خیرباد کہنا بہر حال میرے اختیار میں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب انسان میں کلمۂ حق بلند کرنے کی طاقت نہ رہے تو کم از کم یہ تو اس کے بس میں رہتا ہے کہ وہ باطل کا ساتھ نہ دے۔ میں ان لاکھوں جیالوں کو سلام کرتا ہوں جو مجھ سے کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہوئے اور جنہوں نے بھٹو کی آمریت کو ختم کرنے کے لئے ایک تاریخی جنگ لڑی۔ قوم کے ان قابلِ فخر فرزندوں نے ثابت کر دیا کہ اصل طاقت بندوق پکڑنے والے ہاتھ میں نہیں گولی کھانے والے سینے میں ہوتی ہے۔ اہلِ پاکستان ان عظیم سینوں کو کبھی فراموش نہیں کریں گے جنہوں نے ہر گولی کا استقبال کچھ اس شان سے کیا جیسے ان گولیوں میں موت نہیں حیاتِ جاوداں چھپی ہوئی تھی۔

جب اشتراک زندہ تھا تو حالات مجھے اصغر خاں کے قریب لے گئے تھے مجھے اس سپاہی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جس کا ایمان ہے کہ جھوٹ

مکاری اور ریاکاری کی سیاست کو ختم کیئے۔ بغیر قائد اعظم کا پاکستان اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کا قلعہ نہیں بن سکتا۔ میں نے گھنٹوں اصغر خاں کی رفاقت میں گذارے ان کی باتیں سنیں اور ان کی عملی زندگی کا جائزہ لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کتاب میں ان کی شخصیت کے متعلق کچھ لکھوں، لیکن اصغر خان ایک ایسا موضوع ہے جسے چند صفحات میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کے بارے میں الگ کتاب لکھوں گا۔ ان کی شخصیت کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ میں اصغر خان پر کیئے جانے والے اعتراضات کا مفصل جواب دینا چاہتا ہوں۔ ان پر بنیادی اعتراض تو یہ ہے کہ وہ محض ایک سپاہی ہیں اور ان کے پاس سیاست دان کا دماغ نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہر مسلمان بنیادی طور پر ایک سپاہی ہوتا ہے۔ جو شخص سچا سپاہی نہ ہو وہ سچا مسلمان بھی نہیں ہو سکتا۔ ہماری تو پوری تاریخ سپاہیوں نے اپنے خون سے لکھی ہے۔ کیا صلاح الدین ایوبیؒ سپاہی نہیں تھے؟ کیا فتح علی ٹیپوؒ سپاہی نہیں تھے؟ کیا احمد شاہ ابدالیؒ سپاہی نہیں تھے؟ کیا اورنگ زیبؒ سپاہی نہیں تھے؟ اور کیا ہماری تاریخ کے ان عظیم سپاہیوں کے پاس سیاست دانوں کا دماغ نہیں تھا؟ جو دماغ جھوٹ مکاری اور ریاکاری کے ذریعے اپنے مقاصد کی تکمیل کو سیاست کا درجہ دیتا ہو کیا وہی دماغ سیاستدان کا دماغ ہوتا ہے؟ کیا سچائی کی طاقت پر ایمان رکھنے والا دماغ سیاست دان کا دماغ نہیں ہو سکتا؟ کیا سیاست دان کے لئے ضروری ہے کہ وہ وہی باتیں کہے جو عوام سننا چاہتے ہوں؟ کیا سیاستدان کا یہ فرض نہیں کہ وہ عوام کے سامنے ایسی سچائیاں بھی بیان کرے جو وہ سننا نہ چاہتے ہوں؟ کیا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے بت پرستوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ بُت پرستی کفر ہے اور انسان کو صرف اس اللہ کے سامنے جھکنا چاہیئے

جس کے سوا اور کوئی اللہ نہیں ؟

اب وقت آگیا ہے کہ ایسی سیاست کو دریائے سندھ میں غرق کردیا جائے جس کی بنیاد جھوٹ مکاری اور ریاکاری ہو۔ اب وقت آگیا ہے کہ ایسے سیاست دانوں کو منوں مٹی کے نیچے دفن کردیا جائے جو جھوٹ بول کر عوام کو بے وقوف بناتے ہیں اور عوام کو بے وقوف بنا کر ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ جب تک ایسی سیاست کا نام ونشان نہیں مٹایا جائے گا۔ جب تک ایسے سیاستدانوں کو نیست ونابود نہیں کیا جاتے گا۔ اس وقت تک قائداعظمؒ کا پاکستان، اقبالؒ کے خوابوں کی تعبیر نہیں بنے گا۔

۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کو جس سپاہی نے اپنے ضمیر کی آواز کو لبیک کہہ کر بھٹو کے دورِ استبداد کا خاتمہ کیا تھا اس کے سامنے ایک عظیم چیلنج ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء نافذ کرنے کے فوراً بعد قوم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ آزادانہ اور منصفانہ عام انتخابات کرانے کے بعد اقتدار دوبارہ عوام کے نمائندوں کو سونپ دیں گے۔ وہ اب بھی اس وعدے پر قائم ہیں اور میں ان کے وعدے کی عظمت کو سلام کرتا ہوں، لیکن میرا ایمان ہے کہ پاکستان میں سچی جمہوریت اس وقت تک نافذ نہیں کی جاسکتی جب تک قوم کی تقدیر سے کھیلنے والے طالع آزماؤں اور مفاد پرستوں کو برسرِ عام چوراہوں میں پھانسیاں نہیں دی جاتیں۔

جنرل ضیاء الحق کو سیاست دانوں کے دباؤ کے سامنے جھکنے کی بجائے صرف اپنے ضمیر کے فیصلوں کے سامنے جھکنا چاہیئے۔ کیوں کہ وہ سب سے پہلے قادرِ مطلق کے سامنے جواب دہ ہیں اور اس کے بعد اس کے بندوں کے سامنے۔ اگر جنرل ضیاء الحق نے کوئی غلط فیصلہ کیا تو تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں

کرے گی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحیح فیصلے کرنے کی بصیرت اور ان فیصلوں پر عمل درآمد کرنے کی قوت عطا فرمائے۔ قدرت نے ان کے کندھوں پر ایک عظیم ذمہ داری ڈال دی ہے۔ اس ذمہ داری کا تعلق صرف جمہوریت کی بحالی سے ہی نہیں پاکستان کی بقا سے بھی ہے۔ جمہوریت کی بحالی پاکستان کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ لیکن پاکستان کی بقا کا ایک تقاضہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے تک جمہوریت کی بحالی کا مشن ملتوی کر دیا جائے۔

میں جمہوریت پر اپنی جان فدا کر سکتا ہوں کہ یہ میرے بنیادی حقوق کی محافظ ہے۔ لیکن میرے بنیادی حقوق اگر میرے پاکستان کے لئے خطرہ بن گئے تو میں اپنے پاکستان کے لئے اپنے بنیادی حقوق قربان کر دوں گا۔ عظمتیں قربانیوں کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ میرے پاکستان کو عظمتوں کی تلاش ہے اور مجھے ایک ایسے رہنما کی تلاش ہے۔ جو میرے پاکستان کو عظمتوں کی طرف لے جائے۔

میں کوئی فرد نہیں۔

میں ایک قوم ہوں۔

میں نے ۱۴ سو برس قبل جنم لیا تھا۔

پاکستان میرا نیا وطن ہے۔

---

# حرفِ آخر

ممکن ہے کہ اس کتاب کے قارئین میں کچھ ایسے بھی ہوں جن سے میرا رشتہ ابلاغ پہلے بھی قائم رہ چکا ہے۔ ان سے مخاطب ہونے کا احساس میرے لئے بڑا ہی مُسّرت بخش ہے۔ ان کے سامنے میں ایک وضاحت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں پچھلے سال کراچی سے ایک ہفت روزہ کا اجراء ہوا تھا جس کا نام اشتراک تھا۔ اگرچہ اس اشتراک کے ناشر اور ایڈیٹر میرے پرانے دوست محمد طارق خان تھے لیکن اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے ان حالات سے گلہ ہے جنہوں نے میرے دوست کو اس قسم کا جریدہ شائع کرنے پر مجبور کیا۔ ساتھ ہی اس بات کا افسوس بھی ہے کہ میرے دوست نے اس قسم کے جریدے کے لئے اشتراک کا نام استعمال کیا۔ بہرحال بعض اوقات بہت اچھے اور بہت بڑے بھی ٹھوکریں کھا جاتے ہیں

اس کتاب میں جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے جذبات اور احساسات کی زبان میں لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ کئی قارئین میرے جذبات اور احساسات سے اتفاق نہ کریں۔ ان کی رائے معلوم کر کے مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ جو قارئین مجھے اپنی آراء اور اپنے خیالات سے آگاہ کرنا چاہیں وہ مندرجہ ذیل پتہ پر مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

غلام اکبر
اورنیٹ ایڈورٹائزرز لمیٹیڈ
سیمنٹ بلڈنگ تھارٹن روڈ لاہور فون: ۶۱۲۸۶

## غلام اکبر کے زیرِ طبع ناول

### ○ کاغذ کے پھول

نیکی اور بدی کی جنگ جس میں قہقہے بھی ہیں اور آنسو بھی

### ○ محبّت اور نفرت

ایک ایسی محبّت کی کہانی جس نے نفرت کی کوکھ سے جنم لیا۔

### ○ ساحل اور طوفان

ایک بھائی ساحل تھا اور دوسرا طوفان

○

اسرائیل اور سی آئی اے کی سازشوں کا منہ توڑ جواب دینے والے میجر اسد کے مندرجہ ذیل کارنامے بھی کتابی شکل میں شائع کئے جا رہے ہیں۔

○ آپریشن بغداد ○ آپریشن الفتح ○ آپریشن قاہرہ

○ آپریشن بیروت ○ آپریشن ماسکو

تعبیر پبلیکیشنز ۲۴ گارڈی چیمبرز گارڈی ٹرسٹ بلڈنگ لاہور

اسرائیلی جاسوسوں کے ساتھ

مصری سیکرٹ سروس کے

**میجر اسد**

کا

مقابلہ

# آپریشن قاہرہ

مصنف : غلام اکبر

عنقریب شائع ہو رہا ہے

تعبیر پبلیکیشنز ۴۲ - گارڈی چیمبرس گارڈی ٹرسٹ بلڈنگ لاہور

آپ کے لئے

**دلچسپ اور معیاری**
**کتابوں کی اشاعت**

تعبیر پبلیکیشنز کا
آئندہ شاہکار
مصنف: غلام اکبر
قہقہوں کی زبان میں، آنسوؤں کی کہانی